(ناول)
غالب
قاضی عبدالستار

(ناول)

قاضی عبدالستار

ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔ علی گڑھ

اڈیشن ------ ۱۹۸۶ء

تعداد ------- ۱۰۰۰

قیمت ------ ۳۰/۰۰

کتابت ریاض احمد، الہ آباد

مطبع: ایم۔ اے۔ پرنٹرس، دہلی

EBH

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فون نمبر ۳۷۶۸

انتساب

مرحوم و مغفور صدر جمہوریۂ ہند

عزّت مآب عالی جناب فخرالدّین علی احمد صاحب

کے نام

ہاں غالبؔ خلوت نشیں بیم چناں عیش چنیں
جاسوسِ سلطاں در کمیں مطلوبِ سلطاں در بغل

(غالبؔ)

گذارش احوال واقعی

۱۹۷۳ء میں جب مجھے اردو فکشن کا پہلا "غالب ایوارڈ" تفویض ہوا تو عزت مآب فخرالدین علی احمد نے عزت مآب مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ غالب انعام کمیٹی نے متفقہ طور پر قاضی صاحب کو غالب ایوارڈ اس لئے دیا ہے کہ یہ غالب پر ناول لکھیں گے۔ اس ارشاد پر میں خاموش رہا تھا۔

۱۹۷۴ء میں جب میں پدم شری ہوا اور عزت مآب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا ایک بنگالی ناول نگار (میں نام بھول گیا ہوں) نے میرے اصرار پر ناول لکھنے کی ہامی بھر لی اور چھ مہینے تک دہلی میں قیام کیا اور کچھ کام بھی کر لیا لیکن اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور میرا خواب پورا نہ ہو سکا۔ میں چاہتا ہوں آپ نے جس طرح "صلاح الدین ایوبی" اور "داراشکوہ" لکھی ہے، اسی طرح غالب پر بھی لکھئے —— میں پھر بھی خاموش رہا۔

جنوری میں آخری بار جب میں حاضر خدمت ہوا تو وہ راشٹرپتی بھون کی اسٹڈی میں تشریف فرما تھے۔ اپنے قریب بٹھا کر فرمایا۔ میں گرمیوں میں حیدرآباد جاؤں گا۔ اگر آپ سرسالار جنگ میوزیم سے فیض اٹھانا چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔ کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ میں انکار نہیں کر سکا لیکن گرمیاں آنے سے قبل وہ اس جہان آباد سے چلے گئے۔ اور میرا سفر حیدرآباد ساقط ہو گیا۔ انتقال نے ان کی شفقتوں اور عنایتوں کو جیسے میقل کر دیا۔ عزت مآب کی ہدایت تھی کہ جب میں دہلی اپنے کام سے آؤں تو وقت نکال کر ان کے سکریٹری

کو فون کروں، مجھے باریاب کیا جائے گا۔ میں نے کبھی اس سہولت کا فائدہ نہیں اٹھایا لیکن صرف ایک بار ـــ جب راشٹرپتی بھون پہنچا تو ایک افسر نے سکریٹری کے کمرے میں بٹھا دیا۔ نگاہ اٹھائی تو ایک طرف وائس چانسلر علی محمد خسرو اور پرو وائس چانسلر شفیع انتظار کرتے نظر آئے۔ میں نے کھڑے ہو کر دونوں کو آداب کیا گفتگو کے دوران علم ہوا کہ ایک بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔ ابھی سلسلۂ کلام جاری تھا کہ دو خادم ایک ٹرالی کے ساتھ آئے۔ چاندی کا چھوٹا سا سٹ۔ دو طشتریوں میں سرخ اور سبز مٹھائی۔ اور ایک پیالی۔ ایک شخص نے چائے بنائی، مجھے پیش کی۔ میں پیتا رہا اور انجام سے ڈرتا رہا۔ چائے ختم کر کے انڈیا کنگ ـــ دوسرے آدمی کی دی ہوئی لائٹ سے سلگائی تھی کہ ایک تیسرا شخص کمرے میں آیا۔ میرے قریب جھک کر بولا۔

"قاضی صاحب!"

"جی!"

"تشریف لائیے!"

اسٹڈی میں قدم رکھنے سے قبل گھڑی دیکھی تو ایک بجنے والا تھا۔ صدر جمہوریہ نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا مسکرا کر خیریت پوچھی اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ پندرہ منٹ بعد میں نے اجازت چاہی تو بیٹھنے کا حکم ملا۔ دوسری بار کی اجازت پر باہر نکلا تو پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔

صدر جمہوریہ علی گڑھ آرہے تھے۔ کانوو کیشن کو خطاب کرنے ہفتوں پہلے سے انتظامات شروع ہو گئے۔ علی گڑھ کے چند فن کاروں نے کہا کہ میں ان کے ساتھ صدر سے ملوں اور ان کا تعارف کراؤں۔ میں نے وائس چانسلر خسرو صاحب سے ملاقات کی۔ انھوں نے آدھے گھنٹے کے ڈائیلاگ کے بعد معذوری کا اظہار کر دیا۔ میں نے آفس سے نکلتے ہی صدر جمہوریہ کی خدمت میں ایک خط ارسال کر دیا۔ ایک ہفتے میں جواب کے ساتھ پورا پروگرام

آگیا جس میں میرے نام کے ساتھ چالیس منٹ لکھے ہوئے تھے۔ میں نے کلکٹر سے مل کر پروگرام کی توثیق کی۔ وقت مقررہ پر حاضر ہوا۔ وائس چانسلر کی کوٹھی کے گہرے سبز لان میں سرخ چھتر کے نیچے تشریف فرما تھے۔ خسرو صاحب نے میرا نام پکارا۔ صدر جمہوریہ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ملایا۔ خیریت پوچھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا جو اردو اور ہندی کے فن کار تھے۔ کافی آئی۔ اطہر پرویز نے کافی کی پیالی پیش کی مسکرا کر لے لی۔ اچانک کسی کو خیال آیا کہ تصویر لی جائے۔ میں نے لپک کر خسرو صاحب سے اجازت مانگی۔ انھوں نے بڑی خشکی سے انکار کر دیا۔ میں نے عزت مآب سے گذارش کی۔ انھوں نے فوراً منظور کر لیا۔ وہیں جگہ بنائی گئی اور گروپ فوٹو لیا گیا۔

ترقی اردو بورڈ کے چیرمین کے انتخاب کا مسئلہ زیر غور تھا۔ عجیب عجیب نام سننے میں آرہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس منصب پر وہ شخص فائز کیا جائے جس نے اردو کے لئے کچھ قربان کیا ہو۔ میں دہلی گیا۔ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ سے جن کو میں آپا کہتا ہوں اور جو صدر جمہوریہ کی ہمشیرہ ہیں، مشورہ کیا انھوں نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔ آکا بھائی (صدر جمہوریہ) سے کون کہہ سکتا ہے؟ تم کہہ سکتے ہو   تو کہو۔ صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب دستور چائے پی۔ اور اردو ناول کا ذکر چھیڑ کر وہ نام پیش کر دیا جو میرے نزدیک سب سے محترم اور سب سے زیادہ حقدار تھا۔ وہ سماعت فرماتے رہے۔ ایک دو سوالات بھی کئے۔ جن کے جوابات عرض کرتا رہا۔ چند روز گذرے تھے کہ ایک صبح ریڈیو پر انھیں صاحب کے تقرر کا اعلان ہو گیا۔

جب یہ عنایتیں یاد آئیں تو میں نے طے کیا کہ میں غالب پر ناول لکھوں گا اور صدر جمہوریہ کے نام نامی سے انتساب کروں گا۔

غالب پر ناول لکھنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ میرزا غالب نام کی فلم بن چکی۔ فلم کی کہانی منٹو جیسے صاحب قلم نے لکھی ہے اور ایک ڈومنی کو میرزا کے کندھوں پر سوار کر دیا ہے۔ اور

سب اسی کی محبت کی کہانی سننا ـــــ چاہتے ہیں جو میرے نزدیک سراسر بہتان ہے۔ غالب مغل تہذیب کا فرزند جلیل ہے جس کی آستینوں سے اس تھکے ہوئے زرنگار کلچر کا پسینہ بہہ رہا ہے، جو شاعر ہے، نثر نگار ہے، شرابی ہے، جواری ہے، گنہہ گار ہے، صوفی ہے، موحّد ہے، شیعہ ہے، سنی ہے، کافر ہے، عالم ہے، ہنسوڑ ہے۔ قواب ہے، عاشق ہے خود غرض ہے ـــ چٹکی بھر مسرت کی تلاش میں احسانوں کا کھلیان پھونک دیتا ہے۔ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن اپنے ہم چشموں کی صحبت میں ایک ڈومنی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر نہیں آسکتا کہ یہ اس کی تہذیب کی شریعت کا سب سے بڑا کفر ہے۔ پھر مجھے ایک شعر ملا جس کی روشنائی نے پلاٹ کو منور کر دیا۔ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ نے ترک بیگم کا ذکر کیا، جن کا افسانہ انھیں اپنے خاندان کی وراثت میں ملا۔ اور جس کی صداقت پر اپنے عہد کے سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود نے شک کا اظہار کیا۔ انکار کا نہیں۔

میں نے ازراہ انکساری و خاکساری کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا۔ مقدمہ نہیں لکھا۔ ہمعصروں کی آرا کا جلوس نہیں نکالا۔ صرف قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں جیسی "ہائی برو" فن کاروں کی چند سطریں ضرور شامل کیں۔ یہ شمولیت بھی اظہار تعلق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ سطریں اس لئے لکھنا پڑیں کہ انتساب کی تفصیل کے علاوہ یہ بھی عرض کر سکوں کہ میں نے اپنے تمام ناولوں میں ان کے موضوعات کے مطابق اسلوب نگارش کی تخلیق کی کوشش کی ہے۔ جس طرح مصور کے پاس رنگ ہوتے ہیں اور وہ ہر موزوں تصویر کی مناسبت سے رنگ کا استعمال کرتا ہے، اسی طرح مصنف کے پاس لفظ ہوتے ہیں جن کے انتخاب اور ترتیب سے وہ اپنے اسلوب کو سجاتا اور سنوارتا ہے۔ نہ اکبر بدھو کی زبان میں گفتگو کر سکتا ہے اور نہ بدھو اکبر کی زبان بول سکتا ہے۔ جن حضرات نے ہمراں لالہ، سینگ۔ روپا، ٹھاکر دوارہ۔ پہلا اور آخری خط، شب گزیدہ، صلاح الدین ایوبی اور دارا شکوہ کا مطالعہ کیا ہے انھیں غالب کی نثر بھی مختلف معلوم ہوگی۔ انشاء اللہ۔

غالب کی اشاعت بھی ایک مسئلہ بن گئی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے جنرل سکریٹری جناب جمیل الدین عالی نے۔ انجمن کی مجلس عاملہ سے بطور خاص غالب کی اشاعت کی منظوری حاصل کرلی۔ میں مسودہ بھیجنے والا تھا کہ ایک بزرگ نے مشورہ دیا کہ صدر جمہوریہ سے نسبت رکھنے والے ناول کا پہلی بار پاکستان میں شایع ہونا مناسب نہیں ہے۔ میں نے چاہا کہ ایوان غالب شایع کردے۔ سب کچھ ہو بھی گیا۔ لیکن کتابت کی تصحیح کا جھگڑا باقی رہا۔ بالآخر میں نے اسد یار خاں صاحب کی پیش کش منظور کرلی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کتابت کی غلطیاں کم سے کم ہوں گی۔

میں اس طول کلامی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

معذرت گذار

قاضی عبدالستار

جہان آباد کے خط آسمانی پر شاہجہانی مسجد اپنے میناروں کے عظیم ہاتھ بلند کئے وہ دعا مانگ رہی تھی جس پر قبولیت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ مغرب کے نیلے آسمان کی پہنائیوں میں سرخ سورج ایک لہولہان تمدن کی طرح ڈوب چکا تھا۔ محلسراؤں کے مرغولوں پر کھڑی ہوئی چھتریوں پر بھولے بھٹکے کبوتر اتر رہے تھے۔ جیسے بدنصیب قوموں پر ان کے مسیحا اترتے ہیں اور ان کو پکارنے والی آوازوں سے سناٹا پھوٹ رہا تھا۔ ایک مغلئی محراب پر لرزتے ہوئے ریشمی پردے کے پیچھے قندیل کی مدھم روشنی اس کی تاریک دیوار پر اجالے کی چٹائی سی بچھاتی اور اٹھا لیتی۔ اسی ملگجے اندھیرے میں وہ اپنے چھوٹے سے دالان کے بڑے سے تخت پر تکیئے سے پشت لگائے روشنی کا انتظار کر رہا تھا۔ روشنی کا انتظار تو جیسے اس کا مقدر ہو چکا۔ بچپن سے بڑھاپے تک ساری زندگی .... تمام رات روشنیوں کے انتظار میں بیت گئی اور روشنیاں خواب میں دیکھے ہوئے جگنوؤں کی طرح آنکھ مچولی کرتی رہیں بہلاتی رہیں۔ سامنے آبنوس

کی کشتیاں، تلے ہوئے باداموں کی طشتری کے پاس اکبرآبادی گلاب اور پرتگالی شراب کے شیشے اپنے ہونٹوں پہ مہریں لگائے کھڑے تھے اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ زینے کا حاشیہ ایک قدآدم تصویر کے سفید لباس سے بھر گیا۔

"کون ؟"

"سائیں ہے میرزا صاحب"

"سائیں ؟" وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ پھر اپنا سارا وجود سمیٹ کر تخت سے اترا اور ننگے پاؤں چلا۔ اونچی سفید گول ٹوپی، نیچا ڈھیلا کرتا اور اونچا پائجامہ قریب آگیا۔ سفید داڑھی، سفید مونچھیں، سفید کاکلیں اور قریب آگئیں ... منگل شاہ کی آنکھیں اور بڑی ہوگئیں۔

"کچھ منہ سے بولئے شاہ صاحب"

جب سانس قابو میں آگیا تو منگل شاہ کے منہ سے الفاظ نکلے، جیسے زخم سے خون نکلتا ہے۔

"آپ کی دلّی جو رنگون میں قید تھی، چھوٹ گئی، ہر قید سے چھوٹ گئی۔

"پیرومرشد"

"مر گئے"

اس نے شانوں پر الوان برابر کر لیا کہ اچانک کپکپی سی محسوس ہوئی تھی۔ جب خاموشی بوڑھی ہونے لگی تو منگل شاہ گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہوگئے۔

"اک ذرا ٹھہر جائیے شاہ صاحب ... ملازم روشنی لینے گیا ہے۔"

"وہ ایک دلّی والے اور بھی ہیں میرزا صاحب جن کو پُرسا دینا ہے۔"

"لیکن اس اندھیرے میں آپ "۔

" اندھیرا ہوئے تو مدتیں ہوگئیں میرزا صاحب ۔ اب تو موت کے اندھیرے سے بھی ڈر نہیں لگتا "۔

شاہ صاحب دیوار کے سہارے سیڑھیاں اتر رہے تھے اور وہ دور سے آتی آوازوں کی سیڑھیوں پر بلند ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے گذرا جا رہا تھا۔ اپنا تماشہ تو وہ کتنی ہی بار دیکھ چکا تھا لیکن آج پورا جہان آباد ، پورا ہندوستان گنجفے کے پتوں کی طرح اس کے سامنے ڈھیر تھا۔

بہت دن ہوئے برسات کی لڑکھڑاتی گیلی گلابی شام میں کلو نے چلمن کے پاس آکر عرض کیا تھا ۔

" نواب صاحب فرخ آباد کا چوبدار حاضر ہونا چاہتا ہے "۔

" بلاؤ "۔

پھر ایک لانبا ادھیڑ آدمی کمر میں سبز پٹکہ باندھے چاندی کی موٹھ والی سرخ لکڑی ہاتھ میں لئے سلام کر رہا تھا ۔

" اعلیٰ حضرت لال محل میں حضور کے منتظر ہیں ..... اگر حضور سوار ہونا چاہیں تو سواری حاضر ہے "۔

" سواری پر انتظار کرو "۔

لال محل کے پھاٹک پر سبز اٹان کی وردیاں پہنے برقندازوں کے دستے کے افسر نے فٹن کا دروازہ کھولا اور پیشوائی کرتا پھاٹک کے چھتے تک لے گیا اور وہاں سے نواب کا خاص محافظ خنجر بیگ ساتھ ہولیا۔

دوہرے دالان کے سامنے اونچے چبوترے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ناچ بجانے والے ساز کی آواز نے کانوں پر جنت کے دروازے کھول دیئے۔ گرگابیاں اتارنے کے لیے ٹھٹکا تو جیسے جھوم گیا۔ لے کاری کی سطح سے اٹھتی ہوئی نسوانی آواز کے شعلۂ جوّالہ نے اس کے حواس چکاچوند کر دیئے۔ دروازے پر کلابتو کے موتیوں کی چلمن پڑی تھی۔ اس نے دالان کے گہراتی قالین پر پاؤں رکھا تھا کہ چوبدار نے صدا دی۔

"نواب میرزا اسداللہ بیگ خاں صاحب"

"تشریف لائیے..... سرفراز کیجئے"

"نواب تجمل حسین خاں پاانداز پر کھڑے تھے۔ بھری ہوئی گھونگھرالی سیاہ داڑھی، بانک کی طرح کھنچے ہوئے ابروؤں کی چھاؤں میں بند ہوتی ہوئی کالی آنکھیں، سر پر چار گوشوں کا مغلیہ تاج، بر میں گنگا جل کا خفتان اس کے دامنوں کے نیچے اونچے مشروع کا گزگز بھر کے پائنچوں کا پائجامہ، کسی ہوئی کمر ذرا سی خم، آستینوں سے جھانکتی گوشت سے لدی کلائیاں تصویروں کے سے ہاتھ کھولے منتظر تھیں۔ نواب بغل گیر ہوئے پھر اس کا بایاں ہاتھ اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیا۔ دو جوڑ مؤدب ہاتھوں میں سمیٹی ہوئی چلمن کی محراب سے دونوں اندر آگئے۔ تمام چھت فانوس سے سجی تھی۔ فرش کی بے داغ چاندنی کے دونوں بازوؤں پر استنبولی قالین پڑے تھے۔ وسط میں بالشت بھر اونچی ہاتھی دانت کی صندلی پر بنارسی مسند لگی تھی۔ جس طرف نگاہ اٹھتی کارچوب پردوں، زرنگار طاقوں، مرصع ظرفوں اور سیمیں حاشیوں

کے قد آدم آئینوں سے خیرہ ہو جاتی۔ نواب نے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔
خانم سلطان نے دوسرا تکیہ اس کی پشت سے لگا دیا۔ سامنے نامی گرامی سازندوں
کے ہالے میں نازک اندام اور کمسن چغتائی جان مجرا کر رہی تھیں۔ کتان کی
سرخ پشواز پر کسے ہوئے مطبق پٹکے نے کمر اور مہین کر دی تھی۔ سینہ بلند اور
کولھے بھاری سے ہو گئے تھے۔ سر اٹھا تو جڑاؤ سراسری کا الماس جھمجھانے
لگا اور سازوں پر کلاونت انگلیاں جیسے سوتے سوتے جاگ اٹھیں۔ ساتھ
ہی اس کے بازو پر پھولوں کی ڈالی رینگ گئی۔ گردن گھمائی۔ ایک لونڈی بیگموں
کی طرح آراستہ و پیراستہ ہاتھوں میں چاندی کا طباق لئے گھٹنوں پر کھڑی
تھی اور اس کی سانسوں سے عطر سہاگ کی خوشبو آ رہی تھی اور نواب کا ہاتھ
اصرار کر رہا تھا۔ اس نے طباق سے پگھلی ہوئی آگ کا آبگینہ اٹھا لیا۔ چغتائی
جان نے تان لی تو جیسے تمام روشنیاں شرما گئیں۔ محسوس ہوا جیسے کانوں سے
جگر تک ایک تیر ترازو ہو گیا۔ کسوٹی کی سل پر کندن کی لکیر سی کھنچ گئی۔ پھر اس کی
تانوں سے لفظ ابھرنے لگے جیسے ستارے ابھرتے ہیں۔ وہ گا رہی تھی، اس
کی غزل گا رہی تھی۔ اس کی غزل کو اپنی آواز کا خلعت پہنا رہی تھی۔ چغتائی
جان جس کی آواز قلعۂ مبارک سے کلاں بہادر کی کوٹھی تک یکساں خراج وصول
کر رہی تھی اس کی غزل گا رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خوشی سے بدحواس بیٹھا رہا
پھر ایک ہی گھونٹ میں آبگینہ خالی کر دیا۔ سارا وجود سرخاب کے پر کی طرح
ہلکا ہو چکا تھا، اپنی نگاہ میں قیمتی ہو چکا تھا۔ ملک الشعراء ذوق اور ان کے
شاگرد اور خوشامدی حکیم آغا جان عیش جیسے حاسدان کے یار اور چاپلوس

سب حقیر ہو چکے تھے، ہیچ ہو چکے تھے۔ آنکھ کھولی تو چغتائی جان بیٹھی اس کے سامنے بھاؤ بتا رہی تھیں۔ نہیں ان کے ابرو سر دہی کو جان لینے کے سبق دے رہے تھے۔ آنکھیں سیاہ و سفید اور طلوع و غروب کی داستانیں سنا رہی تھیں۔ ہتھ پھولوں کے بیچ جڑاؤ پہنچتی ہوئی انگلیوں کی یاقوتی چٹکی زمین و آسمان کے مسئلے حل کر رہی تھی۔ گردن کا ہلکا سا ثبت خم کائنات کے پورے وجود پر بھاری تھا۔ پھر وہ اٹھی جیسے پھول سے خوشبو اٹھتی ہے۔ وہ لہریں لیتی ہوئی دوسرے آسن پر پہنچی تھیں کہ نواب نے اشرفیوں کا توڑہ اٹھا کر نذر کر دیا۔ سلام کیا تو اس طرح کہ رخ اُدھر تھا اور آنکھ اِدھر.... پھر وہ آہستہ آہستہ گھمیریاں لیتی رہیں۔ پھر سازوں کی آواز کے ساتھ ساتھ ان کے چکر تیز ہونے لگے، تیز ہوتے گئے۔ ٹنکے ہوئے موتیوں سے پشواز کے بھاری دامن اٹھنے لگے، اٹھتے اٹھتے کمر کے برابر آگئے۔ سرخ ریشمیں زیر جامہ بجلیوں کو اپنے آپ میں سمیٹے گردش کرتا رہا اور وہ سب کچھ جو موجود تھا اس کے ایک وجود تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ابھی وہ تسلیم کر رہی تھیں کہ چوبدار کی آواز بلند ہوئی۔

"چراغ دودمان تیموری .... صاحب عالم ثانی ... اعلیٰ حضرت سراج الدین محمد ظفر۔"

ساری محفل کھڑی ہو گئی۔ نواب نے صندلی سے اتر کر تین سلام کیے اور ہاتھ باندھ لیے۔ خانم سلطان نے کورنش ادا کر کے چاندی کے تھال سے گنگا جمنی گلاب پاش اٹھا کر شاہزادے کے دامن معطر کیے۔ حسن داؤ سے مشک نے

نکل کر آستینوں کو بوسہ دیا اور ہاتھ جوڑ کر خانم سلطان نے عرض کیا۔

"صاحب عالم نے فرمان بھیج دیا ہوتا... لونڈی در دولت پر حاضر ہو جاتی۔"

"سواری کا ادھر سے گذر ہوا تو چغتائی جان کی آواز نے بازو پکڑ کر اتار لیا۔"

چغتائی جان تسلیم کو جھک گئی۔ نواب نے دونوں ہاتھوں سے پیشوائی کی اور صندلی پر بٹھا دیا۔ نواب کا ایک خادم پنکھا ہلانے لگا، دوسرا چنور لے کر گاؤ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ شاہزادے کے اشارے پر وہ دونوں اس کے داہنے بازو پر بیٹھ گئے۔ بائیں طرف خانم سلطان دو زانو ہو گئیں۔ چغتائی جان نے دست بستہ اجازت مانگی۔ شاہزادے نے داہنا ہاتھ اٹھا کر اجازت کے ساتھ حکم دیا۔

"وہی غزل سناؤ... جو سنا رہی تھیں۔"

اور چغتائی جان نے پورے بناؤ اور سجاؤ اور "کہاؤ" کے ساتھ غزل چھیڑ دی، اور سازوں کی آوازوں کے جھرمٹ سے وہی آواز طلوع ہوئی جس کے لفظ لفظ پر جان قربان کر دینے کو جی چاہنے لگتا۔ جیسے زمین و آسمان کے درمیان اس کی آواز کے سوا جو کچھ ہے ناقابل اعتنا ہے۔ اور جب اس نے یہ شعر ادا کیا ؎

دیا ہے شاہ کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

تو ظفر نے پوری آنکھیں کھول کر نواب کو دیکھا۔ نواب نے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ باندھ لئے اور عرض کیا۔

"صاحب عالم ... چغتائی جان شاعرہ ہے۔ اس نے غالب کے مصرعے میں ذرا سی تحریف کر لی ہے۔ مصرعہ تھا ؏

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے"

ظفر نے چغتائی جان کو دیکھا جو لہریں لے رہی تھی اور آہستہ سے کہا۔

"خلق کا ہاتھ اتنا دراز ہو گیا کہ شاہ کی گردن تک پہنچ گیا۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔" نواب کے گلابی چہرے پر ایک پرچھائیں سی آکر چلی گئی۔ چغتائی جان خود اپنی آواز کے رقص اور بدن کی موسیقی کے نشے میں مست در و دیوار تک سے بے نیاز رقص و موسیقی کی ودیوں سے داد وصول کرتی رہی۔ غزل ختم ہوئی تو جیسے اندھیرا ہو گیا۔ شاہزادہ کھڑا ہو چکا تھا۔ ابروؤں کی جنبش سے سلام قبول کئے اور تیر کی طرح باہر نکل گیا۔ بوچے پر سوار ہو کر نگاہ اٹھائی، گویا جھکی ہوئی گردنوں کی کورنش قبول ہوئی۔

محفل پھر آراستہ ہوئی۔ سب کچھ وہی تھا۔ سازوں پر حرکت کرتی ہوئی وہی بے نظر انگلیاں جن کے چھونے سے چنگاریاں نکلنے لگتیں۔ وہی قتالۂ عالم چغتائی جان تھیں جن کا گلا شرساگر تھا اور جن کے پاؤں کی ٹھوکر سے رقص کی جنت کے دروازے کھلتے تھے۔ لیکن نواب کے حواس کا ذائقہ بدل چکا تھا، کڑوا ہو چکا تھا۔ آبگینوں میں جیسے ولایت کی شراب نہیں کھاری باؤلی کا پانی بھرا ہو۔ گھڑی بھر میں جیسے ساری محفل باسی ہو گئی۔

دوسری غزل ہوتے ہی مزاج آشنا خانم سلطان ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئیں۔

"حکم ہو تو دسترخوان لگایا جائے۔"

نواب جو دولھن کی چوٹی کی طرح سجی ہوئی سٹک سے کھیل رہے تھے، کہیں دور سے بولے۔

"بہتر ہے۔" اور پہلو بدل لیا۔ ابھی خانم سلطان کمرے ہی میں تھیں کہ نواب کا خبردار حاضر ہوگیا۔ نواب نے اسے دیکھتے ہی ابرو سمیٹ لئے۔

"سرکار والاتبار کا اقبال سلامت۔" نواب سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور ہنکارے۔

"کہو۔"

"ولی عہد سلطنت خلد آشیاں ہوگئے۔"

"میرزا فخرو، اناللہ۔۔۔" اور صندلی سے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

"قلعۂ مبارک کے دونوں دروازوں پر ماتمی دھنیں بج رہی ہیں اور شہر میں تہلکہ ہے۔"

"جوڑی لگاؤ ہم ابھی سوار ہوں گے۔"

ایک خدمت گذار نے دیبائے رومی کے چغے کی آستینیں کھول دیں۔ نواب نے ہاتھ ڈال دیئے۔ چغتائی جان نے دونوں ہاتھوں میں تلوار سنبھال کر پیش کی۔ خانم سلطان کے اشارے پر ایک لونڈی نے گرگابیاں پاانداز پر رکھ دیں۔ سازندے تصویروں کی طرح ساکت تھے کہ نواب کے اردلی کا افسر کمر میں طپنچوں کی جوڑی لگائے چلمن کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

پھر زری کے جوتوں کی مانوس چاپ اور روشنی سے زینہ بھر گیا۔ میاں کلو نے مردنگ کو اس کے مقام پر رکھا اور الٹے پیروں واپس ہو گئے۔ اس نے طشتری سے بادام اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ گلاب کے شیشے کی مہر توڑ کر آدھے سے زیادہ پیالہ بھر کر اولڈٹام کی بوتل سے لبریز کیا۔ کانپتے ہاتھوں سے پیالہ اٹھایا تو جیسے ترک بیگم کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اس نے لب چوم کر پیالہ رکھ دیا۔ گاؤ سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ سامنے زندہ غالب کھڑا تھا۔ ہاں بڑھاپے کا ایک نام موت بھی ہوتا ہے۔ دراز قد، گٹھا ہوا بدن، چمپئی رنگ، ایسا کہ چہرے پر جہاں حجام کا استرہ لگتا سبزی سی چمک جاتی۔ شراب سے سینچی ہوئی غلافی آنکھیں کہ نہا کر نکلتا تو لال لال ڈورے تیرنے لگتے۔ کھڑی ناک کے دونوں طرف دور تک کھنچے ہوئے گھنے سیاہ ابرو، اکبری ہاتھ کہ بیچ کی انگلی گھٹنوں کے ابھار تک پہنچ جاتی۔ سبز مشروع کے پاجامے کے پائنچوں سے پیر باہر نکلتے تو بڑی بڑی طناز آنکھیں گڑ جاتیں۔ ترک بیگم نے کیسا تڑپ کر کہا تھا کہ آپ کے پاؤں تو رقاص کے پاؤں ہیں ..... کیسی بھری برسات کی کتنی خوبصورت دوپہر تھی۔ آسمان میں جامنی بادلوں کے شامیانے لگے تھے جیسے مغرب کا وقت ہو گیا ہو۔ نم خنک ہوا کی موجوں سے مستی ٹپک رہی تھی جیسے ساقیٔ فطرت نے ایک ایک موج کو شراب میں ڈبو دیا ہو۔ بارہ کی توپ چلے دیر ہو چکی تھی۔ وہ تن سکھ کے کرتے پر جامدانی کی نیم آستین اور سبز گلبدن کا پاجامہ پہنے پانی کے سانس لینے کا انتظار کر رہا تھا، لیکن پانی تھا کہ ایک سان بر سے جا رہا تھا۔ اور وہ اسی پانی میں محلسرا کی طرف چل پڑا۔ ڈیوڑھی سے نکلتے ہی امراؤ بیگم نے

ٹوکا۔

"اللہ آپ نے آواز تک نہ دی۔"

اور وہ سنی ان سنی کرتا پورا صحن پار کر کے صدر کے دوہرے دالان پر چڑھ گیا۔ فرش ...... جیسے یہاں سے وہاں تک بیر بہوٹیاں بچھا دی گئی ہوں۔ مسند کے ساتھ قالین بھی اٹھا دیئے گئے تھے لیکن گاؤ تکیے ٹول کے سنئے غلاف پہنے اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ ایک صحنچی میں انگیٹھیاں دہک رہی تھیں اور پکوانوں کی خوشبوؤں سے پورا دالان بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف سینیوں کی قطار تنکوں کے سرپوشوں پر سرخ پوشش پہنے چنی تھی اور لڑکیوں اور عورتوں کا جھرمٹ لرزاں تھا۔

"ترک بیگم کی وجہ سے کہہ رہی تھی ..... ان سے معذرت کر لیجئے۔"

بیگم نے اسے تو ال دیتے ہوئے چپکے سے کہا اور میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ اس طرح؟"

قطنی کے بھیگے ہوئے سبز کرتے سے ان کی سرخ بلند و بالا محرم جھلک رہی تھی اور جلدی میں اوڑھے ہوئے سبز ریشم کے دوپٹے کے ہالے میں ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں ..... بس یہ دیکھ رہا تھا کہ اس بچے کی پیدائش نے آپ پر کتنے من روپ انڈیلا ہے۔"

"اللہ" اور وہ اس کے ہاتھ سے تو ال جھپٹ کر صحنچی میں گھس گئیں

جہاں ترک بیگم چھپی ہوئی تھیں۔

"ترک بیگم آپ کی خدمت میں آداب پیش کر رہی ہیں"

بیگم نے صحنچی سے اطلاع دی۔ ترک بیگم.... مرہٹہ فوج کے جواں مرگ ایرانی رسالدار کی کمسن بیوہ، جن کی غزلیں وہ پورے ایک سال سے بنا رہا تھا۔ ترک بیگم کی تحریر کے دائرے محبوبوں کے گیسوؤں کے حلقوں کی طرح قاتل اور مرکز محبوبوں کی چال کی طرح ترچھے ہوتے اور جس کے اشعار کی زمین سے درد کی خوشبو سی اٹھتی رہتی۔

"بیگم صاحب فرما رہی ہیں کہ ہم ترک بیگم سے معافی مانگیں لیکن ہم ترک بیگم آپ کو شرمسار نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں کوئی شاعرہ میرا بائی کا مرتبہ نہ پا سکی۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کیوں.... اس لئے کہ کسی مسلمان عورت نے میرا بائی کی طرح گرو کے چرنوں میں بیٹھ کر ودّیا نہیں سیکھی۔ علم زبان اور بدیع و بیان کے نازک ترین مسائل صرف زبان ہی نہیں حل کرتی، آنکھ کی حرکت، ابرو کی جنبش اور لہجے کے زیر و بم کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ آپ یہ پردہ جو کر رہی ہیں، یہ اسلامی پردہ نہیں ہے۔ ورنہ عرب عورتیں نہ میدان جنگ میں تلوار چلاتیں نہ زخمیوں کا مرہم ہو سکتیں۔ یہ پردہ ہندوستان کے ہندوؤں کا پردہ ہے جو انھوں نے مسلمان لٹیروں سے اپنی ناموس بچانے کے لئے مجبوراً اوڑھ لیا تھا۔ آپ میری بات سن رہی ہیں ترک بیگم؟"

"جی سر سے پاؤں تک سماعت ہوں"

زندہ کھرجدار آواز، ہڈیوں میں اترتے ہوئے غم میں شرابور، اپنے آپ پر اعتماد سے دھڑکتی ہوئی۔

"آپ کو معلوم ہے ہم مسلمانوں نے دین کے عالموں کی حرمت کے لئے اپنے بادشاہوں کے تاج اتار دیئے لیکن دنیا کے عالموں کو بکرے کی اوجھڑی پکانے والوں سے بھی حقیر جانا، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا علم ہمارے ہاتھ سے پھسلتا چلا گیا۔ دنیا ہمارے ہاتھ سے نکلتی چلی گئی۔ یہی نہیں بلکہ دین بھی ہماری مٹھیوں کی گرفت میں نہیں رہا۔ ہم بھول گئے کہ مسلمان کے لئے دین و دنیا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ آپ نے گرو دکھشنا کا نام سنا ہے ترک بیگم؟"

"جی.... جی نہیں۔"

"مہابھارت کے ہیرو اور راجہ یدھشٹر کے بیٹے ارجن کے گرو درونا چاریہ نے جب دیکھا کہ ان کا ایک بھیل شاگرد فن تیر اندازی میں فضیلت رکھتا ہے تو انھوں نے اپنے بھیل شاگرد سے گرو دکھشنا میں اس کا داہنے ہاتھ کا انگوٹھا مانگ لیا اور اس شیر دل نے انگوٹھا اتار کر گرو دیو کے چرنوں میں ڈال دیا۔ آپ جانتی ہوں گی کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان فرق کا ایک نام انگوٹھا بھی ہے۔ انسانی تہذیب کی آدھی کمائی اسی ایک انگوٹھے کے گرد گھومتی ہے تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ آپ ہماری شاگرد ہیں اور ہم آپ کے گرو، تو کم از کم گرو دکھشنا ہی کے نام پر آپ ہم سے اپنا پردہ اٹھا دیجئے۔"

"سمجھ گئیں ترک بیگم، اس لمبی چوڑی تقریر کا مطلب کیا ہے؟" امراؤ بیگم نے چمک کر کہا۔

پہلوؤں کے دونوں دالانوں کے کنارے کے دروں میں رنگی چنگی ریشوں
کے جھولے پڑے تھے۔ لڑکیاں بالیاں جھونٹے لے رہی تھیں اور چھاجوں برستے
پانی کی بوچھاروں میں بھیگ رہی تھیں اور ان کے تیز رنگوں کے کپڑوں سے ہر
طرف چمن سے کھلے ہوئے تھے اور صدر کے دوہرے دالان کے وسط میں
دستر خوان سج رہا تھا۔ گرم گرم نمکین اور کھٹے اور میٹھے پکوانوں کے طباق اتر
رہے تھے اور قابیں سج رہی تھیں اور میاں گھمن کی دولھن اور بی وفادار
نے سب کو بلا کر دستر خوان پر بٹھا دیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ صحنچی کے در سے
نور کے سانچے میں ڈھلی ایک زندہ مورت نکلی اور امراؤ بیگم کے پہلو میں بیٹھ
گئی۔ ڈہڑہاتے رنگوں کے ڈھیر میں وہ سفید اُڑسی پائجامے، سفید کرتے،
سفید شلوکے اور سفید ہی دوپٹے میں آسمانی مخلوق معلوم ہو رہی تھی جیسے
سزا کے طور پر دنیا کے عذاب خانے میں بھیج دیا گیا ہو۔ سونے کے تاروں کی
طرح چمکتے ہوئے ڈھیروں بالوں، سرخی مایل سنہرے بالوں کی موٹی موٹی بغیر
موباف کی چوٹی۔ اس کے داہنے پہلو میں پڑی تھی۔ نہ ہاتھوں میں مہندی،
نہ دانتوں میں مسی، نہ ہونٹوں پر پان کی دھڑی، نہ آنکھوں میں سرمے کی
لکیر، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں، نہ پیروں میں پازیب .... زیور کے نام پر داہنے
ہاتھ کی لانبی انگلی میں ننھے سے ہیرے کی انگوٹھی کے سوا کچھ بھی نہ تھا لیکن
وہ سب کچھ تھا جو کسی کو اس کی تمام آرائشیں عطا کر سکتی ہیں۔ اس نے دیکھا
تو دیکھتا رہ گیا، جیسے نظریں قابو سے نکل گئیں، اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئیں۔
وہ سر سے پاؤں تک سن ہو چکا تھا۔ زبان ذائقہ بھول گئی تھی۔ وہ نوالے اس

طرح منہ میں رکھ رہا تھا جیسے حلوائی دونے میں مٹھائی رکھتا ہے۔ لڑکیوں کے چہچے اور بیگموں کے قہقہے کسی دوسرے دیس کی آوازیں تھیں جن سے اس کی سماعت بوجھل تھی۔ پھر اس کے سامنے بی وفادار نے ایک خوان لاکر رکھ دیا جس میں اندرسے کی گولیوں کا تھال، سبز و سرخ چنریوں کا ڈھیر، ہری لال نخوں کے لچھے رکھے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا لیکن نہیں دیکھ رہا تھا۔ بی وفادار نے قریب آکر کہا۔

"بیگم صاحب کے مایکے سے آیا ہے۔"

وہ خاموش رہا تو بی وفادار نے پوچھا۔

"آموں کی لگن لگاؤں؟"

"نہیں۔"

بی وفادار اگر اس وقت تخت طاؤس لگانے کی اجازت مانگتیں تو بھی محروم رہتیں۔ چھوٹے بھائی میرزا یوسف کی دولھن نے خاصدان پیش کیا۔ ایک پان اس طرح لے لیا جیسے امرار دینی محفلوں میں تبرک لیتے ہیں۔ ترک بیگم سفید دوپٹے کے پلوؤں سے اپنا آپا ڈھکے اس طرح بیٹھی تھیں کہ سامنے ہونے کے باوجود سامنے نہیں تھیں لیکن اس تیسری آنکھ کے سامنے ان کے جسم کا ایک ایک خط، ایک ایک خم اس طرح کھلا پڑا تھا جیسے سامنے لگا ہوا دسترخوان دیر کے بعد اس کے دامن سماعت پر جیسے موتی رول دیے گئے۔ وہ اسے اپنی آواز عطا کر رہی تھیں۔

۱ "جو غزل آپ نے بنا کر دی تھی وہ سبز قدم بوا نے کہیں تلف کر دی۔"

"جیسے رضیہ سلطانہ کہہ رہی ہو دلی ہمارے غلاموں نے کھو دی"۔
"کوئی حرج نہیں اس کی نقل بھیج دیجئے میں دوبارہ بنا دوں گا"۔
"نقل ہی تو ہمارے پاس محفوظ نہیں"۔
"ہونہہ ... بی وفادار ذرا اپنی بیگم کا قلم دان تو لانا"۔
بی وفادار نے ایک طاق سے صندل کا قلم دان اور صندوقچہ اٹھا کر سامنے رکھ دیا اور وہ ترک بیگم کی اصلاح کی ہوئی پوری غزل یاد کر کے لکھنے لگا اور خود اپنے حافظے کی داد دیتا رہا۔ ترک بیگم نے دونوں ہاتھوں میں کاغذ تھام کر مطلع پر نگاہ ڈالی تو جیسے نگاہ جم کر رہ گئی۔ وہ ایک ایک شعر پڑھتی جاتی اور کنکھیوں سے اسے دیکھتی جاتی۔ وہ چوری چوری کی آدھی آدھی نگاہیں اس کے اپنے فن کی ایسی اور اتنی مکمل تعریف تھیں کہ ان کے سامنے نظیری اور عرفی کی عمر بھر کی شاہانہ بخششوں کی کہانیاں حقیر معلوم ہوئیں۔ جب ترک بیگم کھڑی ہوئیں تو ان کے کرتے کے دامنوں اور دوپٹے کے پلوؤں سے چھپے ہوئے پاؤں برہنہ ہو گئے۔ سرخ و سفید تندرست ترشے ہوئے پاؤں، جیسے سونے اور چاندی کو ملا کر شاہی زرگروں نے مدتوں کی ریاضت کے بعد گھڑا ہو اور ان پر عقیق یمنی کے ناخن جڑے ہوئے ہوں۔ چغتائی جان جیسی بے نظیر رقاصہ کے سڈول پیر ان کے سامنے لکڑی کی کھڑاؤں کا جوڑا معلوم ہوئے۔ جب وہ جانے کے لئے مڑیں اور ان کی ایڑیاں نظر آئیں تو محسوس ہوا جیسے پائجامے کی چوڑیوں کے نیچے بیر بہوٹیوں کے گچھے رکھے ہوئے۔ سیکڑوں پیروں میں چکنے والے ان پیروں نے ہی تو اسے منزلِ مقصود کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ پھول والوں کی سیر کا

زمانہ تھا۔ امراؤ بیگم اپنے مائکے گئی تھیں کہ راجہ بلوان سنگھ کے بھائی کنور گردھاری سنگھ اکبر آباد سے دلی آئے اور اسے اپنی شکرم میں اس طرح چڑھالیا جیسے سباب کے بقچے رکھے جاتے ہیں۔ آسمان پر بادل کا دل بادل کھڑا تھا۔ وہ مسجد قوۃ الاسلام کے درودیوار دیکھتا ہوا چھوٹے سے مزار کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دور سرسبز ٹیلوں کے پاس شاہی ہرنوں کا جوڑا سرخ جھولیں پہنے دوب چر رہا تھا۔ وہ ان پر نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ سیاہ برقعوں کی ایک ڈار آرام پائیاں اتارنے لگی اور اچانک جیسے آنکھیں روشن ہوگئیں۔ سیاہ پائنچوں میں وہی پانوں چمک رہے تھے جیسے دو مشعلیں جل رہی ہوں۔ جب وہ فاتحہ پڑھ کر نکلیں اور قطب مینار کی طرف چلیں تو وہ بھی تھوڑے فاصلوں سے ان پیروں کے نشانوں پر اپنے تلووں سے سجدے کرتا چلنے لگا اور اس کی فراست نے تاڑلیا کہ بھاری نقاب میں چھپی ہوئی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ پھر وہ پیر بوڑھے پیروں کے ایک جوڑے کے ساتھ ٹھٹکنے لگے۔ پھر ایک غول پھاٹک کی طرف نکل گیا اور دوسرا قطب مینار کے دروازے میں غروب ہوگیا اور بوا سبز قدم نے اپنے برقعے کی نقاب الٹ دی اور آہستہ آہستہ اس کی طرف چلیں۔ ان کے سلام کے جواب میں اس نے کہا

"بوا سبز قدم اگر تم نقاب نہ الٹتیں تو میں تم کو کسی مشہور ڈیوڑھی کی بیگم سمجھتا رہتا۔"

اور بوا کے طباق ایسے ادھیڑ چہرے پر گلابیاں چھوٹنے لگیں۔

"اے میرزا صاحب آپ بھی۔"

خفقان کی جیب سے ایک روپیہ نکال کر ان کی مٹھی میں بند کر دیا۔
"بوا... زندگی میں پہلی بار آپ سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔"
"بوا کی سات جانیں قربان آپ پرسے میرزا صاحب... آپ فرمائیے تو۔"
"ہم نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی بیگم کے ساتھ کمال جمال کی درگاہ میں فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کی بیگم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ ہماری شاگرد ہیں اور شاگرد بھی ایسی کہ زبان نہیں کھولتیں۔"
"اور کیا میرزا صاحب استاد کی جوتیاں کبھی شاگرد اپنے سر پہ رکھ لے تو کم ہے۔"
"لیکن یہ جو دنیا کے کتے ہیں ان کی زبانیں بس لٹکی رہتی ہیں۔"
"اے میاں جوتیوں سے آگے آگے چلتی ہیں۔"
"تو بوا کوئی صورت نکالئے اور آپ ہی نکال سکتی ہیں۔"
بوا کو مدتوں بعد اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو جھوم گئیں اور اعتماد کے ساتھ بولیں۔
"ایسا کیجئے میرزا صاحب کہ آپ چل رکھئے، میں بیگم صاحب کو لے کر آتی ہوں، لیکن ذرا دیر لگ جائے گی۔"
"ہم قیامت تک انتظار کریں گے۔"
وہ بوا کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر درگاہ کی طرف مڑ گیا۔ درگاہ کے حصار کے پورب میں ٹیلے پر سنگ سرخ کی چھتری کھلی پڑی تھی۔ وہ مشرقی رخ کی جالیوں سے ٹیک لگا کر دراز ہو گیا۔ دیر کے بعد جب سورج چڑھنے

لگا اور دھوپ تیز ہونے لگی تب ایک ڈولی آتی نظر آئی۔ وہ نیچے اتر آیا اور کہاروں کو روک کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بوا سبز قدم ہیں؟"

کہاروں نے ڈولی رکھ دی۔ ان کے باہر نکلتے ہی محسوس ہوا جیسے دل ہڈیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ریڑھ کی پوری ہڈی درد سے چمک اٹھی۔ وہ تھوڑی دیر ان کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر ایک بار اور بوا کی مٹھی کھول کر بند کر دی۔ درگاہ کے دروازے پر جہاں ڈولیوں کی قطاریں چنی تھیں اور مردوں، عورتوں اور بچوں کے ڈھیر لگے تھے۔ بوا سبز قدم وہیں ایک سائبان کے نیچے بیٹھ گئیں اور وہ ترک بیگم کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا درگاہ میں داخل ہو گیا۔ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر نگاہ انھیں پر جڑی ہوئی ہے۔ تاہم مزار کے قبے میں اس طرح داخل ہوئے جیسے مدتوں سے اسی طرح زیارت کرتے آ رہے ہوں۔ فاتحہ پڑھ کر باہر نکلتے ہی وہ جہانگیر مسجد کی طرف چلا۔ ترک بیگم لرزتے قدموں سے پیچھے تھیں۔ زینے سے نکل کر جب وہ شہ نشیں کی طرف مڑا تو بیگم ٹھٹک گئیں۔

"آپ نے مجھ بدنصیب کی نہیں تو اپنی عزت کا خیال کیا ہوتا سبز قدم کیا سوچتی ہوگی۔"

بیگم نے برقعے کے دونوں دامن اس کے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔

"آپ پسینے میں ڈوب رہی ہیں ترک بیگم۔"

اور برقعہ اتار کر اپنے کاندھوں پر ڈال لیا۔ بیگم نے سیاہ دوپٹے میں اپنا آپا چھپانا چاہا تو اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"ترک بیگم آج اپنے حسن کی جنت کے دروازے کھول دیجئے۔ ہم پر اعتماد کیجئے۔ آپ کی عزت اور حرمت کے سب سے بڑے محافظ ہم خود ہیں۔"

ترک بیگم کے ہاتھوں کے روپہلے کبوتر اس کے ہاتھوں میں پھڑپھڑا کر خاموش ہو گئے تھے۔ جسم پھولوں سے لدی شاخ کی طرح لرز رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے تربتر تھیں اور ان کے دونوں طرف سنہرے سرخ بالوں کی لٹیں ہل رہی تھیں۔ اس سے زیادہ کسی خواہش کی تکمیل سے انکار کر رہی تھیں اور آنکھیں اس کی آنکھوں میں پڑی تھیں۔

"غور سے دیکھئے ہماری آنکھوں میں شریف محبت کے علاوہ کسی جذبے کی پرچھائیں تک نہ ہوگی۔"

"کاش آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر عمل کیا ہوتا۔ کاش آپ کی زبان سے یہ جملہ ہم نے سکرات کے عالم میں سنا ہوتا۔"

"بیگم۔"

"بیگم نہیں ترک بیگم میرزا صاحب۔ آپ کی بیگم لوہارو گئی ہوئی ہیں۔ آپ نے ہم کو کیسی نیک بخت بیوی کی نظر سے گرا دیا۔"

"ترک بیگم ناگواری کی یہ تمام باتیں تم اپنی غزلوں کے ساتھ لکھ کر بھیج سکتی ہو لیکن یہ چند لمحے جو تقدیر نے ہماری گود میں ڈال دیئے ہیں۔"

"نہیں.... آپ کی تدبیر نے آپ کی گود میں ڈال دیئے ہیں۔"

"خیر یونہی سہی لیکن ہماری آنکھوں پر خدا کے واسطے اتنا ظلم نہ کیجئے۔"

"ظلم سے آپ کا کیا رشتہ... ظلم تو ہم عورتوں کا مقدر ہیں۔ آپ تو چھری ہیں۔ آپ خربوزے پر گریں یا خربوزہ آپ پر گر پڑے۔ زخم بہر حال خربوزے کا نصیب ہوگا۔"

اور ترک بیگم نے اس کے شانے سے برقعہ کھینچ لیا۔

" ہماری آرزو تھی کہ ہم تمھارے منہ سے تمھاری غزل سنتے۔ تمھیں کیا معلوم کہ امراؤ بیگم نے تمھاری غزل خوانی کی کس کس طرح تعریف کی ہے۔"

لیکن وہ برقعہ پہن کر چھپاک سے زینے میں غروب ہوگئیں۔ اور جیسے آنکھوں سے روشنی چلی گئی۔

دن مہینوں سے اور مہینے برسوں سے زیادہ لمبے ہوتے گئے۔ مدتوں کے بعد کہیں ایک آدھ غزل وضعداری کے طور پر آتی اور بن کر چلی جاتی۔ امراؤ بیگم کبھی ذکر بھی کرتیں تو اتنا کہ اتنے دن ہو گئے ترک بیگم نہیں آئیں۔ پھر ایک رات اس کا ہنستا کھیلتا بچہ چٹ پٹ ہوگیا جیسے شیشہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور کچھ بنائے نہ بنے۔ وہ امراؤ بیگم کو تھپک کر باہر آرہا تھا کہ ڈیوڑھی کا چھتہ جھنجھنا گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئیں۔ اکہری نقاب کے پیچھے آنکھیں دہک رہی تھیں، جیسے پوچھ رہی ہوں میرزا صاحب ننھے کو کیا ہوگیا تھا؟

" ایک ننھے کی جان دے کر اگر تمھارا ایک دیدار نصیب ہو جائے تو بھی یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

وہ ڈیوڑھی سے نکل آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ وہ اسی جگہ اسی طرح کھڑی تھیں۔

دیوان خانہ خالی پڑا تھا۔ سارے آدمی محل سرا میں تھے ۔ وہ شانوں پر الوان ڈالے ٹہلتا رہا۔ دو کا گجر بج چکا تھا اور وہ ٹہل رہا تھا کہ زینے پر محتاط قدموں کی سہمی سہمی چاپ محسوس ہوئی۔

"آپ .... ترک بیگم آپ .... اور اس وقت !"

"تقدیروں کے بننے اور بگڑنے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔"

"اندر آجائیے۔"

اس نے لپک کر چلمن اٹھا دی۔ وہ پا انداز پر کھڑی تھیں اور اس کے ہاتھ کمرے میں موجود تمام مردنگ، تمام کنول اور تمام شمعدان روشن کر رہے تھے۔

"آپ کیا کر رہے ہیں ؟"

"دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام روشنیاں آپ کے وجود سے پھوٹتے ہوئے نور کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔"

اور وہ دیوار پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ دوشالہ شانوں سے ڈھلک گیا۔ اس نے مونڈھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ہاتھوں کو رکھ لینے دیا گیا۔ اس نے سرخ سنہرے بالوں سے ہونٹ جلا لئے۔ ہونٹ جلتے رہے۔ سر سے پاؤں تک لرزتا ہوا، دہکتا ہوا، دھڑکتا ہوا بدن ذرا سا کسمسایا۔ لالوں لال آنکھیں دھاروں دھار رو رہی تھیں۔

"آپ نے یہ کیا کہہ ڈالا میرزا صاحب۔"

"ہم نے سچ کہا ہے ترک بیگم .... اگر واقعی خدا ہے تو ہم اس کو حاضر

ورنہ ناظر جان کر تم کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے سچ کہا ہے۔"
وہ دیر تک اسی طرح کھڑی اس کو دیکھتی رہیں۔ ایک ٹک دیکھتی رہیں۔
"معاف کر دیجئے.... ہماری بیوگی کے تصدق میں ہمیں معاف کر دیجئے۔"
اور ان کا سر ڈھلک کر ان کے گریبان میں آگیا۔
"ہم نے تم سے کہا تھا کہ تمھاری عزت اور حرمت کے سب سے
بڑے محافظ ہم خود ہیں۔"
"ہاں فرمایا تھا۔"
"تمھارے یہاں اس طرح آنے کے راز سے کون واقف ہے؟"
"سبز قدم.... زینے پر ٹھری ہوئی ہے۔"
"جی تو چاہتا ہے کہ ایک قیمتی راز کی طرح آپ کو اپنے سینے میں چھپالیں۔
لباس کی طرح یوں پہن لیں کہ آپ پر کسی کی نگاہ نہ پڑے لیکن کیا کریں آپ کی
حرمت کے لئے آپ کو پھر دیکھے بغیر رخصت کرنا پڑ رہا ہے۔
انھوں نے دوشالے کو بنا کر اوڑھ لیا۔
"لیکن ایک شرط ہے ... آپ جلد سے جلد ہم سے ملیں گی۔"
"انشاءاللہ۔"
"کب ... کہاں ... اور کیسے .... یہ سب آپ پر منحصر ہے۔"
"لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟"
"اگر یہ ممکن نہیں ہوا تو ہم دن دہاڑے آپ کی محل سرا میں گھس آئیں گے۔"
"نہیں ... نہیں۔"

"قلم ہمارا کھلونا ہے ترک بیگم جس سے ہم اپنے دکھ کو بہلاتے ہیں لیکن تلوار ہماری وراثت بھی ہے اور ہماری آبرو بھی۔"

"ہم تو اسی مہینے آگرے کے لئے سوار ہونے والے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"ہماری چھوٹی بہن کی نند کی شادی ہے۔ اگلے ماہ میں اس کا شدید اصرار ہے کہ ..."

"سفر کی سبیل کیا ہو گی؟"

"حکیم غلام حسین صاحب اس کی خوش دامن کو دیکھنے جانے والے ہیں۔ ان کو واپس لے کر جو پالکی دلی آئے گی، ہم اسی سے سوار ہو جائیں گے۔"

اور وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔

"ہوں۔"

اور اس کا سر کمہار کے چاک کی طرح گھومنے لگا۔

صبح ہوتے ہوتے اس نے کنور گردھاری سنگھ کے نام خط لکھ کر آدمی کو اکبر آباد روانہ کیا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہم کو اگر جیتا دیکھنا چاہتے ہو تو گھڑی سواری جہان آباد پہنچو۔ پانچویں دن کی شام گہری ہو رہی تھی اور وہ پیالہ ڈھال رہا تھا کہ زینے پر گھوڑے چڑھنے لگے۔ کنور گردھاری سنگھ برجیس پر ساق پوش اور بوٹ چڑھائے کمرے میں طپنچہ لگائے سامنے کھڑے تھے۔

"خیریت ہے میرزا صاحب؟"

کنور نے بغل گیر ہو کر پوچھا۔

"تم آگئے... تو خیریت آگئی"۔

"دیکھو جی میرزا صاحب، تم ہو شاعر اور ہم ہیں سپاہی۔ حرفوں کے طوطے مینے اپنے پاس رکھو اور معاملے کی بات کرو ہم سے"۔

"ارے یار تم تو اپچی بنے کھڑے ہو، ذرا نہاؤ دھوؤ، کپڑے پہنو۔ لال پری کا ایک آدھ پرا اڑاؤ۔ معاملے کی بات بھی ہو جائے گی"۔

"اوں ہوں... پہلے بات پھر گھات"۔

"تو سنو مجھے آگرے سے دہلی کے لئے ایک جوڑی چاہئے پورے تام جھام کے ساتھ زنانی سواریوں کے لئے اور جب میں مانگوں تب ملے"۔

"بس؟"

"بس"۔

"بھلے مانس تم نے مجھ سے کہا ہوتا کہ اپنے ہاتھوں کی جوڑی کاٹ کر دے دے تو میں کچھ سوچتا بچارتا، لیکن یہ فٹن شکرم بھی کوئی شئے تھی جس کے لئے اتنا طومار باندھ ڈالا۔ اماں ایک پرزہ لکھ کر بھیج دیا ہوتا۔ جہاں اور جب اور جو کچھ طلب کرتے حاضر ہو جاتا... فلانے سنگھ جوتے کھول آکر"۔

جب سیر سیر بھر گوشت کے کباب اور آدھ آدھ سیر شراب پیٹ میں اتر لی تو اس نے کنور سے پوچھا۔

"آگرے کے نجف علی کمیدان کو جانتے ہو۔

"کمیدان صاحب کا پور پور بال بال جانتا ہوں"۔

"اور دلی کے حکیم غلام حسین کو بھی جانتے ہو؟"

"سات پشتوں تک کو جانتا ہوں۔"

"تو جب حکیم صاحب کمیدان صاحب کی بیگم کو دیکھ کر دلی کے لئے سوار ہوں ہو تو تمھاری سواریوں میں سوار ہوں اور انھیں سواریوں پر کمیدان صاحب کے مہمان دلّی سے آگرے کے لئے سوار ہو جائیں۔"

کنور نے ابرو سمیٹ کر پیالہ رکھ دیا۔

"بھائی میرے یہ سب ہو جائے گا لیکن تیرا آخر کیا فائدہ ہوگا۔"

"اگر میرا کوئی فائدہ نہ ہوتا تو تم کو اتنی تکلیف کیوں دیتا۔"

"دیکھ بھائی ہم کھانڈے بھالے کے آدمی ہیں۔ یہ تریا چلتر تو جان۔"

اور ایک ہی گھونٹ میں پیالہ انڈیل لیا۔

کنور کے رخصت ہوتے ہی اس نے پنشن کے مقدمے کی آڑ میں اکبرآباد کے سفر کا اعلان کر دیا اور انتظام کرنے لگا۔ سبز قدم اس کے خفیہ منصوبے کے متعلقات سے بھرے ہوئے پرزے لاتی لے جاتی رہیں۔ ابھی حکیم غلام حسین دہلی سے چار کوس کے فاصلے پر تھے کہ کنور گردھاری سنگھ کا سوار ایک کوتل گھوڑا لے کر حاضر ہو گیا۔ اس نے سامان کے بقچے اس کے حوالے کئے۔ امراؤ بیگم سے امام ضامن بندھوایا اور سوار ہو گیا۔ رات رجگیر گاؤں کی سرائے میں گذاری۔ دوپہر کا کھانا کھا کر حقہ پی رہا تھا کہ سوار نے کنور کے اترنے کی اطلاع دی۔ باہر نکلا تو ایک ذوکڑی اور دو شکرمیں کھولی جا رہی تھیں اور کئی سوار گھوڑے تھامے کھڑے تھے۔ تیار کمروں میں گدیلوں پر چاندنیاں لگی تھیں۔ دروازوں پر دھلے پردے پڑے تھے اور کھانا تیار تھا۔ پہلے بوا

سبز قدم بغل میں حسن دان لئے اتریں، ان کے پیچھے پیچھے ترک بیگم سفید براق برقعہ پہنے تشریف لائیں۔ جب سبز قدم سامان منگوانے کے لئے باہر آئیں تو وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیگم دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ لے کر آنکھوں سے لگا لئے۔ وہ بے نیازسی کھڑی رہیں۔ نہ خوش، نہ رنجیدہ، نہ مضطرب، نہ مطمئن، آپ اپنی تماشائی۔

"آپ جانتی ہیں کہ ہم آپ کی آواز کے عاشق ہیں۔ اور آپ اس طرح کھڑی ہیں گویا یہ پہلی بے نظیر اور آزاد ملاقات روزمرہ کا معمول ہے۔"

"ہم نے دیکھا ہے کہ قربانی کے لئے بکرے کو نہلاتے دھلاتے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل لگاتے، کامدار مخمل کے پٹے اور گہنے پہناتے ہیں، پلنگ پر بستر لگا کر بٹھاتے ہیں، دودھ جلیبی کھلاتے ہیں اور عید قرباں کی صبح ذبح کر ڈالتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر بھی قربانی کے اسی بکرے کا گمان ہوتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو ترک بیگم ؟"

"سچ کہہ رہی ہوں میرزا صاحب... ایک سبز قدم تک تو خیر صبر تھا لیکن اب کتنے ہی لوگ میری رسوائی کے چشم دید گواہ ہو چکے ہوں گے۔ اور مثل ہے ہونٹوں اتری کوٹھوں چڑھی۔ جس دن میرا راز فاش ہوا میرزا صاحب وہی دن میرے لئے عید قرباں کا دن ہو جائے گا۔"

بوا کے قدموں کی چاپ پر اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے اور کنور کے پاس چلا آیا۔ وہ سفری کپڑوں میں مسند سے لگے پیچوان کی دستگی سے کھیل رہے تھے۔

"آیئے مرزا صاحب جلدی سے ضروری باتیں ہو جائیں تو ہم سوار ہوں۔"

"اتنی عجلت کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہے .... تو سنئے کمیدان صاحب سے طے ہوا تھا کہ آج جمعہ کے دن ہم کو دہلی پہنچنا ہے۔ تین چار دن جانوروں کے آرام کے لئے دلّی میں قیام کرنا ہے۔ اس طرح منگل یا بدھ کو سوار ہو کر پانچ چھ روز میں آگرہ اتر پڑنا ہے۔ یعنی آج سے آٹھ دس روز آپ کے پاس ہیں کم سے کم۔"

"اور زیادہ سے زیادہ؟"

زیادہ سے زیادہ کی ایک صورت یہ ہے کہ روز مقررہ کمیدان صاحب کے پاس ایک سوار چلا جائے گا کہ سواریاں فتحپور سیکری کی زیارت کرتی ہوئی آرہی ہیں۔ تین چار دن اور بن جائیں گے۔ جہاں تک میرے آدمیوں کا سوال ہے تو وہ بندوق کی نال پر بھی وہی کہیں گے جو میں کہوں گا۔"

"ہوں۔"

"رہی یہ کباب کی ہڈی۔"

"کباب کی ہڈی۔"

"ارے یہ جو بڑھیا ہے، اس کا انتظام یہ ہے کہ بھرت پور کے قریب ہماری جاگیر پر بھیج دی جائے گی۔ آگرہ میں آپ کے داخل ہونے سے چند گھنٹے قبل ایک تشکرم اسے اڑا لائے گی۔ رہے ہم تو ہم آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے اور آپ کے ساتھ رہیں گے بھی۔ یعنی اتنی دوری پر رہیں گے کہ گھڑی بھر میں سوار گھوڑا اٹھا کر پہنچ جائے .... درشن سنگھ!"

"مہاراج۔"

"یہ میرزا صاحب ہمارے دوست نہیں ہیں بڑے بھائی ہیں۔ تم نے ہم پر بندوق بھی اٹھائی تو معاف کر دیں گے لیکن ان کو اگر میلی نگاہ سے بھی دیکھ لیا تو سر اتار لیں گے۔"

"کیا مجال مہاراج۔"

"گھوڑے لگاؤ۔"

اور کنور کھڑے ہو گئے۔

"ارے کھانا تو کھائے بھائی۔"

"کھانا سندیلہ میں کھاؤں گا۔ یہاں سے تین چار میل پر میرا ایک یار رہتا ہے، اس کو اطلاع ہے کہ میں آرہا ہوں ... درشن سنگھ۔"

"مہاراج۔"

"پورے سفر میں اگر بھائی صاحب کا تانبے کا ایک پیسہ خرچ ہو گیا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ لوں گا۔"

"جو حکم مہاراج۔"

اور دالان ہی سے اچھل کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ہاتھ ملا کر دونوں جوڑے اور گھوڑا کڑکڑا دیا۔ سب کچھ اس طرح ہو گیا جیسے داستانوں میں ہوتا ہے۔ بوا سبز قدم نے اطلاع دی کہ بیگم کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی زعفران کی خوشبو سے شرابور ہو گیا۔ مرغ مسلّم کی بریانی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"چاول شام تک بگڑ جاتے اس لئے میں نے اس وقت صرف بریانی

لگا دی ہے۔ بسم اللہ کیجئے۔"

اور انھوں نے اپنے لئے الگ پلیٹ میں نکالنے کے لئے چمچہ اٹھالیا۔

"ترک بیگم.... آج خدا کی رحمت سے یہ نادر موقع میسّر آیا کہ ہم تمھارے ہاتھ کا کھانا کھانے بیٹھے ہیں تو تمھارے ساتھ ہی کھائیں گے۔"

اور ان کے ہاتھ سے پلیٹ چھین لی۔ ایک لقمہ اٹھایا تو جیسے ذائقہ زندہ ہوگیا، جوان ہوگیا، مست ہوگیا۔ ترک بیگم آہستہ آہستہ کھا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے کمر سے پیش قبض نکال کر پیش کیا۔ اس نے مرغ چاک کیا تو پیٹ سے چار تلی ہوئی بٹیریں برآمد ہوئیں۔

"کیا ساری رات کھانا پکاتی رہیں؟"

"کل سارا دن اور آج ساری رات باورچی خانے میں گذاری ہے۔"

پہلی بار اسے سبز قدم کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"معلوم ہے کہ دسترخوان پر کھانے کی تعریف ڈوم کرتے ہیں لیکن تمھارے ہاتھ کی بریانی کی لذّت نے مجبور کر دیا۔"

ترک بیگم نے سر کو اور جھکا لیا۔

"ہم نے زندگی میں پہلی بار اتنی لذیذ بریانی کھائی ہے۔"

تانبے کا سرپوش ہٹا کر بیگم نے ایک بادیہ سامنے رکھ دیا۔ اس نے ایک چمچہ منھ میں رکھا تو اپنی آواز سنی۔

"سبحان اللہ.... ایک بات کہوں ترک بیگم .... دسترخوان کی شیرینی گھر کے تمدن کی علامت ہوتی ہے۔ خدا کی قسم اگر خدا ہے۔

"نعوذ باللہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔"

"ہاں ترک بیگم کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ اگر خدا ہوتا تو دنیا میں اتنی حق تلفی نہ ہوتی، اتنی بدنظمی نہ ہوتی، اتنی ناانصافی نہ ہوتی۔ پھر خیال آتا ہے کہ خدا ہے ورنہ ہم اس کی قسم کیوں کھاتے۔ ہاں تو خدا کی قسم ترک بیگم اگر ہم ترکستان میں ہوتے اور ہمارے ہاتھ سے سلطنت نہ نکل گئی ہوتی تو ہم آپ کو اپنی بیگم بنا لینے کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے۔

سبز قدم نے دسترخوان اٹھایا۔ اندر سے پردہ برابر کیا۔ باہر سے دروازہ بند کیا۔ کھڑکی کے راستے سے کنوار کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے بیگم نے کھلی سے ہاتھ دھو کر حسن دان کھولا اور چکنی ڈلی کے ساتھ الائچی پیش کی۔

"حسن دان میں الائچی؟"

اسے اپنے سوال کی کاٹ پر خود حیرت ہوئی۔

"ہمارے خاندان کی عورتیں حسن دان کے بغیر نہیں چلتیں اور حسن دان بیوہ عورتوں کو زیب نہیں دیتے اور بیوہ عورتیں رسموں کو تبدیل کبھی نہیں کر سکتیں اس لئے ہم نے حسن دان میں ڈلی اور الائچی رکھ لی۔"

"ترک بیگم..... ہماری آپ سے گذارش ہے آپ آئندہ کبھی اپنے آپ کو ہمارے سامنے بیوہ نہیں کہیں گی۔"

"رات کو اگر رات نہ کہا جائے تو وہ دن نہیں ہو جاتی۔"

"ہو جاتی ہے..... خدا کی قسم جس رات کے بطن سے تمہارے قرب کا سورج طلوع ہو وہ ہمارے لئے چمکتے ہوئے دنوں سے زیادہ روشن ہے۔"

"یہ شاعری ہے میرزا صاحب۔ زندگی کی حقیقتوں کی سنگینی اور اشعار کے تخیل کی رعنائی کے درمیان کوئی رشتہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔"

انھوں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کے سینے پر آرہیں۔ پھر معلوم نہیں کیوں کران کے سنہرے سرخ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کے بازوؤں پر پھیل گئیں۔ وہ تھوڑی دیر خاموش ان پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اس کے کرتے کے بوتام ترک بیگم کے ہونٹوں کو چومتے رہے۔ پھر بیگم نے سنا۔

"بیگم ایک شعر ہوگیا۔"

"سنا دیجئے۔"

"نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

انھوں نے گریبان سے سر اٹھایا۔

"بہت حسین شعر ہے... اس شعر کی قیمت میں اگر زلفوں سے ہاتھ دھونے پڑجائیں تو بھی یہ سودا سود ہی سود ہے۔"

"سچ ؟"

سر جھک گیا... گریبان سے آواز آئی۔

"سچ۔"

"تو سن رکھو ترک بیگم۔ تمھاری ان زلفوں کے لئے خوبصورت آگ کی ان بے مثال لٹوں کے لئے نہیں، ان کے ایک ایک بال کی سلامتی کے لئے ہماری سات سات جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔"

جواب میں محسوس ہوا کہ اس کے کرتے کا بوتام ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی انگلیوں سے ان زلفوں میں جو اس کے شانوں پہ بکھری تھیں شانہ کرتا رہا۔ دروازے پہ دستک ہوئی۔ وہ اپنے خوابوں کی جنت سے باہر نکلا تو شام ہو چکی تھی کمرے میں اندھیرے کا ڈھیر لگ رہا تھا۔

"آجاؤ۔"

گریبان سے آواز آئی اور اس کا سینہ خالی ہو گیا۔

روشنیوں کے ساتھ سبز قدم نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ وہ مسند سے لگا بیٹھا ہے اور اس کی بیگم اس کے پاس بیٹھی ہیں اور اس طرح کہ ان کے سارے بال دونوں شانوں پر ڈھیر ہیں اور بلند و بالا سینے کی چوٹیاں سیاہ ریشم کے کرتے کے نقاب میں ہر سانس کی جنبش پر دھڑک رہی ہیں اور کچھ بال ٹوٹ کر آنکھوں کی سفیدی میں تیر رہے ہیں۔

"سبز قدم یہاں میرے قریب آؤ۔"

کہیں دور سے بیگم کی آواز آئی۔ سبز قدم پا انداز سے کھسک کر لبِ فرش تک آگئی۔

"آج میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں .... پہلی اور آخری۔"

"فرمائیے۔"

"ہم نے تم کو ایک تنخواہ دار ملازمہ کی طرح کبھی نہیں جانا۔ ہمیشہ اپنے مغرور خاندان کے ایک بزرگ کی طرح برتا ہے۔"

"لیکن آج آپ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"تقدیر نے ایسے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے کہ کہنا پڑ رہا ہے ... سبز قدم اگر تم نے ہمارے راز کو راز رکھا تو ہم آج سے تم کو اپنی ماں کی طرح برتنے کی قسم کھاتے ہیں اور اگر تم نے زندگی میں کبھی غداری کی تو تمہارا پیٹ چاک کر کے اپنے سینے میں خنجر بھونک لیں گے۔"

"میری جان تو صدقے کی چڑیا ہے بیگم جب حکم دیجئے وار دوں لیکن اپنے لئے مجھ کو کمبخت کے سامنے کبھی ایسا لفظ نہ نکالئے گا۔ بیگم یہی میری تنخواہ ہے یہی میری منت ہے۔"

اور بوا دوسری شمع لینے کمرے سے چلی گئی۔

"تم نے دیکھا ترک بیگم اس شمع کی آمد سے پہلے کمرے میں تاریکیوں کے ڈھیر لگے تھے لیکن اس کے طلوع ہوتے ہی وہ کافور ہو گئے۔ اسی طرح تمہارے قرب کی چھوٹی سی شمع جلتے ہی ہماری تمام سیاہ بختیاں حافظے سے رخصت ہو گئیں۔"

"بوا سبز قدم۔"

"جی میرزا صاحب۔"

"وہ کونے میں رکھا ہوا چمڑے کا تھیلا اٹھا دیجئے اور ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی لے آئیے۔"

تھیلا پکڑ کر وہ صراحی لینے چلی گئی۔

ہندوستان کے لوگ جب اپنے مطلوب سے ملتے ہیں تو اپنی خامیوں پر پردے ڈال لیتے ہیں اور خوبیوں میں کلی پھندنے ٹانک دیتے ہیں۔ ہم

ماوراالنہر کے شہزادے اپنے چہرے کے تمام داغوں اور کردار کے تمام دھبوں کے ساتھ تمھارے سامنے آئیں گے کہ یہ ہمارے گھر کا چلن ہے۔"

پھر موم جامے کی تھیلی کھول کر تلے ہوئے باداموں سے بیگم کی ہتھیلیاں بھر دیں۔

"جب کھانا کھائیے آواز دے لیجئے میں شکرم کے پاس لیٹی ہوں۔"

اس نے تھیلے سے بوتل نکالی اور ایک تہائی پیالہ بھر کر صراحی سے لبریز کر لیا اور ترک بیگم کے ہاتھوں سے چند بادام اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔ ترک بیگم سونے چاندی کے مجسمے کی طرح بیٹھی تھیں، بیٹھی رہیں۔ اس نے پیالہ اٹھا لیا۔

"آج ترک بیگم کے حسن کی قربت کے نام... کہ ایک مدت سے ترک بیگم کے نام پر پیتا آرہا ہوں۔"

ایک ہی سانس میں پورا پیالہ کھینچ کر فرش پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب آنکھیں کھولیں تو ترک بیگم اسی طرح بیٹھی تھیں جس طرح بیٹھی تھیں۔ بس اتنا کیا کہ بادام پلیٹ میں رکھ دیئے۔

"ہندوستان کے ایک بے نظیر شاعر نے حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ اس کے کولہے شراب حسن سے بھرے ہوئے قرابے تھے۔ خدا کی قسم جب تک ہم نے تم کو دیکھا نہیں تھا اس تشبیہ کی صداقت پر ایمان نہیں لائے تھے لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ تم اس تشبیہ سے زیادہ حسین ہو۔"

اتنا سنتے ہی ترک بیگم کھڑی ہو گئیں اور ان کے پاؤں برہنہ ہو گئے اور۔

"بیگم .... تمھیں اس کی قسم جس کو تم سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہو، اپنے پانوں چوم لینے دو۔"

"اتنا گنہہ گار نہ کیجئے مرزا صاحب۔"

اور انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"مرد اور عورت کی زندگی میں صرف ایک رات آتی ہے جب مذہب اور سماج اور تہذیب اور خاندان جیسے تمام ادارے پوری آزادی کے ساتھ مدتوں سے دہکتے ہوئے جذبات کی تسکین کی اجازت دے ڈالتے ہیں اور دونوں اپنے جسم کی دنیاؤں سے روشناس ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو روشناس کراتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک معمولی سی رسم کے سر انجام پر مبنی ہوتا ہے .... رسم اور روایت تو یہ ہے۔ ایک بات پوچھوں ترک بیگم۔"

"جی۔"

"تمھارے پیروں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ قسم کھالیں کہ یہ کسی رقاصہ کے پیر ہیں۔"

بیگم نے آنکھیں جھکالیں۔ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور اپنے ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔

"بولو.... بولو نا۔"

"ترک بیگم محبت کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب دونوں اپنے اپنے خفیہ قلعوں کے دروازے ایک دوسرے پر کھول دیتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو اپنے خفیہ قلعے کی کنجی آپ کے دیوان خانے میں چھوڑ آئے۔"

"ترک بیگم"

"ہماری آپ سے صرف ایک گذارش ہے آپ ہمیشہ اپنا قول یاد رکھیں کہ آپ ہماری عزت اور عصمت کے سب سے بڑے محافظ ہیں"

"سولی کے تختے پر بھی یاد رہے گا۔ ترک بیگم بدن کی موسیقی کا نام رقص اور آواز کے رقص کا نام موسیقی ہے لیکن یہ دونوں تمھاری حویلی کی اونچی اونچی دیواریں کس طرح پھلانگ گئے"

دیر کے اصرار کے بعد وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگیں۔

آپ کو شاید معلوم نہیں میری والدہ بچپن ہی میں مرحومہ ہو گئی تھیں اور والد سپاہی تھے اور فوجیں لڑاتے تھے۔ خدا ان دونوں کو کروٹ کروٹ جنت دے۔ ہماری پرورش دادی جان نے کی۔ ہماری انّا ایک بنگالن تھی جو ایک فن میں یکتا اور دوسرے میں طاق تھی۔ ہم نے چھوٹی سی عمر میں ناچ دیکھا اور اس کی نقل کی۔ انّا نے نقل کرتے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ ایک ایک جنبش سر تال میں تھی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ جب عشا پڑھ کر دادی جان افیون کی گولی منہ میں رکھتیں اور سو جاتیں تب ہم چھپر کھٹ سے اٹھتے۔ انا کی انگلی پکڑ کر چار چھے کمرے چھوڑ کر ایک ایک گھنگھرو پاؤں میں باندھتے اور ناچتے رہتے۔ ایک ایک دو دو کا گجر بج جاتا اور خبر نہ ہوتی۔ شادی ہوئی تو ایسے یار کھسے کہ ایسی ویسی آوازوں سے ان کے کان دکھنے لگتے، بے ہنگم چال تک سے آنکھیں پرانے لگتیں۔ خود بدولت کسی ساز میں بند نہ تھے لیکن دلربا ایسا بجاتے کہ شاید کوئی بجاتا ہو۔ ساری ساری رات وہ ساز بجاتے رہتے اور ہم ناچتے رہتے۔ لال قلعے سے نئی بیگم

کا ناچ دیکھ کر آئے۔ کمر کھول رہے تھے بولے گنی بیگم کا سارا ناچ ایک طرف اور ہماری بیگم کی ایک ٹھوکر ایک طرف۔ واللہ کوئی بسنت نہیں جس دن وہ سدھارے ہم نے ان درنوں پر بھی خاک ڈال دی۔ پانچ برس ہونے کو آئے اب تو ہاتھ پاؤں لکڑی ہو کر رہ گئے۔"

"آپ کیا سوچنے لگے ؟"

"سوچتا ہوں کہ تم جب آج ایسی ہو تو کل کیسی رہی ہو گی اور یہ بھی کہ وہ شخص کتنا خوش نصیب تھا کہ تمہاری ایسی بیگم نصیب ہو گئی اور وہ کتنا بد نصیب تھا کہ ... ہمارا خیال تھا ترک بیگم کہ جب ہم پیالہ اٹھائیں گے تو تم بھڑک اٹھو گی لیکن تم اس طرح بیٹھی رہیں جیسے ہمارے پیالے میں شراب نہیں شربت انار ہو۔"

"ہم نے تو ان کے پیالے پر جن کا جنم جنم کا ساتھ تھا ترچھی نگاہ نہ ڈالی اور آپ بہر حال پرائے ہیں اور یہ بھی کہ جب نور جہاں جیسی ملکہ عالم اپنے شوہر کی شراب نہ چھڑا سکی تو ہما شما کس شمار قطار میں ہیں ... کتنے پیالے پیتے ہیں آپ ؟"

"چار ... لیکن آج صرف ایک پیوں گا۔"

"کیوں ؟"

"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

تین پیالے ہم نے ترک بیگم کی قربت کی نذر کر دیئے کہ ترک بیگم سر سے پاؤں تک

میخانہ ہے۔ اس کی ہر ادا بے خود کر دینے کے لئے کافی ہے۔"
اور بوتل بند ہو کر چپ میں تھیلے میں چلی گئی اور داہنے پیر پہ ہونٹ دھنس گئے
لگے۔

"در شن سنگھ حاضر ہے نواب صاحب۔"
"کہو۔"
"اگر ماما کو بھرت پور بھیجنا چاہیں تو سواری تیار ہے۔"
"نہیں وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"
بیگم نے جلدی سے جواب دیا۔
"ایک تسمہ تو لگا رہنے دیجئے۔ معلوم نہیں الٹی سیدھی کیسی آن پڑے۔"
"جیسی آپ کی مرضی۔"
جب دسترخوان اٹھ گیا اور بوا سبز قدم اپنی جگہ پہ پہنچ گئیں اور
ترک بیگم نے اپنا بھی بستر کر لیا تو اس نے کونے میں کھڑی ہوئی تلوار نیام
سے نکالی اور ترک بیگم کے بستر کی سفید براق چاندنی کے بیچوں بیچ رکھ دی
اور ایک تکیہ برابر رکھ کر دوسرے پر سر ڈال دیا۔
"آئیے ترک بیگم ہمارے پاس لیٹ جائیے۔ ہمارے آپ کے درمیان
یہ تلوار نہیں دیوار چین ہے۔ آئیے ...۔ آ بھی جائیے ... گذارش ہے ترک بیگم
مان لیجئے۔"
اور اس نے اٹھ کر ترک بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بستر پر لٹا دیا۔ بیگم دوسری
طرف منہ کئے لیٹی رہیں اور وہ چھت کی کڑیاں گنتا رہا اور بیگم کے بدن سے

دہکتی خالص مکمل اور بھرپور عورت کی خوشبو میں شرابور ہوتا رہا۔ ان کے انگ انگ کی آنچ سے تپتا رہا اور جب سر سے پانوں تک دہکنے لگا تو اٹھ بیٹھا۔ بیگم کا داہنا ہاتھ ان کے کولھے سے اٹھ کر تھام لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔ چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں سرخ تھیں۔

"ترک بیگم تم کو اپنے نام ترک بیگم کے ترک اور تمھارے سامنے بیٹھے ہوئے تمھارے عاشق زندہ ترک میں سے کسی ایک کو قتل کرنا ہے اور ابھی۔"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔"

"اور اگر تم یہ کام انجام نہیں دے سکتیں تو یہ زندہ ترک تمھارے پہلو میں لیٹی ہوئی اس تلوار کو اپنے پیٹ میں بھونک لے گا۔"

اور اس نے بستر سے تلوار اٹھالی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ آنکھوں کو پڑھتے پڑھتے جیسے سہم گئیں۔ اٹھیں اور کونے سے نیام اٹھا لائیں اور دونوں ہاتھوں سے تلوار چھین کر غلاف کرنے لگیں لیکن اس نے انھیں بازوؤں سے پکڑ لیا۔

"پہلے اپنی زبان سے اپنا نام بتا دیجئے۔"

"منھ سے بولئے۔ ہم ہر رسم اور ہر شرط کے لئے تیار ہیں۔"

"ترک بیگم آپ کے سر کی قسم ساری عمر ہم اسی طرح آپ کے ہاتھ پکڑے کھڑے رہیں گے۔"

انھوں نے گردن اٹھائی تو دو آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر رخساروں پر

ڈھلک آئے۔ اس نے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔ دیر کے بعد کہیں دور سے آواز آئی۔

"آپ جو نام رکھ دیں گے ہم قبول کر لیں گے۔"

دو لانبی چوڑی مضبوط باہوں نے ساری سموچی بیگم کو سمیٹ کر اٹھا لیا اور سارے بدن پر بوسوں کی اتنی بارش ہوئی کہ وہ نڈھال ہو گئیں۔

متھرا کے سامنے اور دریا کے کنارے جب اس کی دوکڑی پہنچی تو آسمان سے سورج ڈھلک رہا تھا اور اس کے بازو پر ایک ماہتاب چمک رہا تھا کہ درشن سنگھ گھوڑا بڑھا کر قریب آ گیا۔

"جمنا جی کے اس پار راجہ صاحب دوگاداں کا پکا باغ ہے۔ اس کی بارہ دری سجی ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو وہاں اتریں اور چاہیں تو شہر کی سرائے۔"

"باغ ہی میں اتریں گے۔"

دروازے سے بارہ دری تک سارا باغ سرسبز اور شاداب بوٹا بوٹا بھرا ہوا، پتہ پتہ دھلا ہوا اور بارہ دری فرش و فروش سے آراستہ اور جھاڑ فانوس سے پیراستہ۔ عقب میں قد آدم باڑھ کے اندر لبالب بھرا ہوا سنگ خارا کا حوض اور اس کے اندر چھوٹی سی سنگ سرخ کی چھتری تنی ہوئی اور اس تک پہنچنے کے لئے رسیوں سے بندھی پتلی سی ڈونگی پڑی ہوئی باڑھ سے پرے فصیل کے دونوں بازوؤں پہ دریا کے اوپر دو برج بنے ہوئے، دونوں میں فرش لگے ہوئے جیسے راجہ صاحب دوگاداں ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئے ہیں۔ بیگم نے تالاب کو دیکھا تو چہک گئیں کھل اٹھیں۔

"یہاں کوئی آتو نہیں سکتا۔"

"ہمارا خیال ہے کہ اب تو راجہ دوگاداں بھی چاہیں تو کنور کی اجازت کے بغیر نہیں آسکتے۔"

"بوا میرے کپڑوں کی زرد چھوٹی بقچی لے آئیے۔"

اور وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے پائجامے کی چوڑیاں چڑھانے لگیں لیکن اسے دیکھتا پاکر چوڑیاں گرانے لگیں۔

"ایک بات آپ سے کہوں ... آپ ذرا بارہ دری میں چلے جائیے میں ذرا ہاتھ منھ دھوؤں گی۔"

وہ بارہ دری کے چبوترے سے گزرتا ہوا سامنے آگیا۔ گوشے پر کھڑے مہندی کے نیچے پڑی ہوئی سنگیں چوکی پر پانوں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازے کے اندر دالان کے سامنے اینٹوں کے چولھے سلگنے لگے تھے اور پھاٹک کے باہر ابھی تک گھوڑے ٹہلائے جا رہے تھے۔ پھر ایک سپاہی تازہ بھرا ہوا سفری حقہ دے کر الٹے پیروں چلا گیا۔ سورج دور کھڑے ہوئے درختوں کی پھننگیوں پر سیندور سے بھرے تھال کی طرح رکھا تھا۔

"پھاٹک کی بغل میں پنگھٹ لگی ہے میں ذرا وہاں تک جا رہی ہوں۔"

اس نے چونک کر سنا اور پھر اپنے خیالوں کی دنیا میں چلا آیا جہاں نئی نئی زمینیں اٹھ رہی تھیں۔ ردیفیں مچل رہی تھیں اور قافیے ہمک رہے تھے۔ اور خیالوں کی کہکشاں تھی کہ یہاں سے وہاں تک پڑی جگمگا رہی تھی اور ان سے دور بہت دور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیروں اور چھوٹی چھوٹی

کھوپڑیوں والے بہت سے آدمی رینگ رہے تھے اور پرانے جوہڑ کے سڑے ہوئے پانیوں میں ٹوٹی پھوٹی لکڑیوں میں لمحوں اور ثانیوں کا چارہ لگائے روزمرّے اور محاورے کی مچھلیاں مار رہے تھے اور ایک دوسرے کو ان بیش یا افتادہ کامیابیوں پر داد دے رہے تھے، مبارکباد دے رہے تھے اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر حقارت سے ہنس رہے تھے، نفرت سے تھوک رہے تھے کسی نے اس کے کان میں کہا۔ یہ حکیم آغا جان عیش اور اس کی ذریات ہے۔ وہ مسکرا کر اٹھا۔ حقہ بارہ دری کے ستون سے لگا کر کھڑا کیا اور چبوترے پر ٹہلتا ہوا حوض کی طرف نکل آیا اور جیسے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اعصاب کو سکتہ سا ہوگیا۔ ساری قوتِ احساس سمٹ کر آنکھوں میں آگئی۔ جیسے نورجہاں قلعۂ اکبرآباد کے حمام میں غسل کر رہی ہو۔ سرخ وسفید شیشے کے ڈھلے ہوئے بدن کے گنبدوں پر ڈوبتے سورج کی لالی کی چھوٹ پڑ رہی تھی اور تمام تشبیہوں سے بلند ہو چکے تھے۔ اور ان محرابوں کو اگر ابلیس دیکھ لیتا تو سجدے میں گر پڑتا اور ان ستونوں کے جمال کے سامنے تختِ سلیمانی کے پائے بھی حقیر معلوم ہوتے۔ گوشت و پوست کے وہ زندہ پیچ وخم کہ اگر خضر والیاس کو گنہگاروں کی آنکھیں میسر آسکتیں تو ساری عمر بھٹکتے رہتے اور شرمندہ نہ ہوتے۔ ہائے چشمۂ حیواں کہ اگر سکندر دیکھ لیتا تو شہنشاہی کو لات مار کر ڈوب مرنے کی آرزو کرنے لگتا۔ وہ اپنے سر کی جنبشوں سے آئینہ ساں پیٹھ پر ڈھیر بھیگی ہوئی لپٹوں سے پانی جھٹک رہی تھیں اور حسنِ بےحجابا کے بے پناہ نظارے کے جادو سے پتھر ہو چکا تھا۔ پیر زمین میں دفن ہو چکے

تھے اور نگاہیں آنکھوں کی قدرت سے منحرف ہو چکی تھیں۔ پھر سورج بدن کو لباس کی بدلیاں گھیرنے لگیں اور وہ غروب ہونے لگا۔ غروب ہو گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ دوسری دنیا سے واپس آرہا ہو، دوبارہ زندہ ہو رہا ہو۔ پانؤں زمین پر ٹکنے لگے اور پلکیں جھپکنے لگیں۔ سفید محرم پر سفید ریشمی اربی پائجامہ پہن کر سفید پشواز پر سفید شلوکہ پہن لیا تو اسے خیال آیا کہ تہذیب نے کپڑے کی ایجاد کر کے مخلوق خدا کو حسن و جمال کے کیسے کیسے بے پناہ نظاروں سے محروم کر دیا۔ کیا اس آسمانی مخلوق میں جو ان چند گز کپڑوں میں چھپا دی گئی ہے اور اس عورت میں جو سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی کوئی رشتہ ہے۔ کوئی مقابلہ ہو سکتا ہے۔

"ارے آپ"

اور وہ اس طرح سہم کر لپک گئی جیسے ہرنی نے شکاری دیکھ لیا ہو۔

"کب آئے آپ؟"

"ابھی جب آپ کپڑے پہن چکی تھیں"

"اللہ آواز کیوں نہ دی آپ نے؟"

"ہم نے چاہا تھا لیکن آواز نکلی نہیں"

وہ قریب سے گزرنے لگیں تو اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا اور اس کے سر سے تولیہ اتار کر مورنگھی پر ڈال دیا اور اس کے نم بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"دونوں وقت مل رہے ہیں اندر چلئے"

انھوں نے آہستہ سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ بارہ دری میں داخل ہوتے دیکھا تو بوا سبز قدم گود میں کچھ سنبھالے مشعلچی کو ساتھ لئے چلی آرہی ہیں۔ جب بارہ دری منور ہو گئی تو اس نے مشعلچی سے کہا کہ حوض کی چھتری میں بھی روشنی رکھ دے۔ ہم کھانا وہیں کھائیں گے۔ بیگم سبز قدم کے ساتھ سامان درست کرتی رہیں، کھانے کے لئے ہدایات دیتی رہیں اور وہ مسند پر سر رکھے اپنے خیالوں کے منہ زور گھوڑوں کو تھپکتا رہا۔

آپ نے کہا تھا کہ محبت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خزانے کی کنجیاں ایک دوسرے کے ہاتھ میں رکھ دیں۔

"ہاں کہا تھا۔"

وہ ابھر کر گاؤ سے لگ گیا۔

"جس بنگالن اتانے مجھے بقول آپ کے بدن کی موسیقی یعنی رقص کی تعلیم دی وہ یہی سبز قدم ہیں۔"

اور بوا سبز قدم ماتھے پر ہاتھ رکھ کر تسلیم کے لئے جھک گئیں۔

بوا سبز قدم ہم نے لڑکپن میں تلوار کے کچھ ہاتھ سیکھے تھے۔ مدتیں ہو گئیں کہ ان کا آموختہ نہیں کیا لیکن آج بھی تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جائیں تو ایرے غیرے دو چار آدمی ہمارے قریب نہیں بھٹک سکتے۔"

"میاں .... ناچ کے سبق کا معاملہ تلوار سے جدا ہوتا ہے۔ ناچ بدن کے لوچ سے نکلتا ہے اور لوچ ریاض سے پیدا ہوتا ہے اور ریاض ہی سے قائم رہتا ہے لیکن میاں لوچ کی ایک عمر ہوتی ہے۔ میرے لئے تو اب تھرکنا بھی

ممکن نہیں لیکن ماشے اللہ سے اگر بیگم گھنگھرو پہن کر کھڑی ہو جائیں تو ان کی عمر کی بڑی بڑی ہنر مندیں دیکھتی رہ جائیں۔"

"تو بوا سبز قدم میں کیا جتن کروں کہ آپ کی بیگم ہمیں سرفراز کرنے کے لئے گھنگھرو پہن کر کھڑی ہو جائیں۔"

"وہی کیجئے میاں جو کر کے بیگم کو یہاں لا کر بٹھا دیا.... اچھا میں کھانا گرم کر لاتی ہوں۔"

"بیٹھئے تو.... کھانا بھی کھا لیں گے۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کا گھرانا کون سا ہے؟"

"گھرانا کیا میاں، سچ یہ ہے کہ میرا دادا بڑا گنوان تھا لیکن خود رو تھا اور سراج الدولہ کے دربار کا نایک تھا۔ اسی کا ورثہ میرے باپ کو ملا کہ اکیلے تھے اور بیگم کی ددیہال سے وابستہ تھے۔ جب ان کی ماں کا جنت سے بلاوا آیا تو دودھ پیتی تھیں اور میری گود بھری تھی اور خاوند خانہ داماد تھا۔ باپ نے حکم دیا کہ ہم حویلی میں اٹھ جائیں اور بے ماں کی اولاد کو پھول پان کی طرح رکھیں۔ سو میاں اس طرح رکھا کہ اپنی کوکھ جل گئی۔ پہلوٹھی کا بیٹا سوکھ کر مر گیا لیکن بیگم کو اللہ قیامت تک جیتا رکھے ان کا رنگ بھی میلا نہ ہونے دیا۔ جب خیر سے یہ دولھن بنیں اور دولھا کے گھر سدھارنے لگیں تو مجھے بھی ان کے ڈولے میں چڑھا دیا گیا۔ سو میاں وہ دن اور آج کا دن ان کی پٹی سے لگے بیٹھے ہیں اور اللہ پاک سے ایک ہی دعا ہے کہ مر کے اٹھیں۔"

"آپ کے شوہر حیات ہیں؟"

"لال قلعے میں شہزادے قطب الدین کو تعلیم دیتے ہیں"۔۔ ہمارے لئے بس اتنے زندہ ہیں کہ ان کے نام پر چوڑی مستی کر لیتے ہیں، زنگا جنگا پہن لیتے ہیں"

"پہلوٹھی کے بیٹے کے بعد بوا کے کوئی اولاد نہیں ہوئی"

بیگم نے اطلاع دی۔

"اچھا ہوا بیگم کہ نہیں ہوئی۔ نہ ہونے کا ایک دکھ اور ہونے کے سو دکھ۔ معلوم نہیں چور ہوتا، اچکا ہوتا اور یہ کچھ نہ ہوتا تو اپنے باپ کی طرح طوطا چشم مقرر ہوتا۔ اللہ آپ کو جیتا رکھے۔ ہمارے دہی نہیں کہ پوت نہیں"

"بوا آپ سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے"

"کہہ ڈالئے میاں"

"آج سے آپ نام کی بوا اور مقام کی ماں"

" میں صدقے قربان اس ماں کہن والے پر"

اور بوا نے وہیں کھڑے کھڑے چٹ چٹ بلائیں لے ڈالیں اور پلو کو منہ پر رکھ کر باہر چلی گئیں اور اس کی جولانیوں پر جیسے کسی نے پانی انڈیل دیا۔

"یہ عورت تو جیتی جاگتی کہانی ہے بیگم"

"کتنی ہی عورتیں کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو نہ سنی جاتی ہیں نہ سنائی جاتی ہیں، نہ لکھی جاتی ہیں نہ پڑھی جاتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس کا گھر اجاڑنے والی ناشدنی میں ہوں۔ جس دن سے یہ ہماری حویلی میں آئی اسی دن سے اس کے اور شوہر کے درمیان دیوار کھڑی ہو گئی اور بیٹے کی موت کے بعد تو جیسے

ایک تسمہ جو لگا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔

"ہمارے تصیب کا بھی جواب نہیں ہے بیگم ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے"

"اللہ یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو۔ دیکھئے کتنی دیر سے آپ کا تھیلا اپنا منہ بند کئے بیٹھا ہے۔ اسے ہاتھوں سے سرخرو کیجئے۔ بادام نکال کر ہماری ہتھیلی کی طشتری میں رکھئے۔ اور آگے بھی میں ہی کہوں"

اس نے مسکرا کر دیکھا۔ تھیلا کھول کر وہ سب کچھ کرنے لگا جس کا حکم دیا گیا تھا۔ پیالہ اٹھانے سے پہلے وہ گردن آگے بڑھاتا۔ داہنے ہاتھ کی سرخ ہتھیلی بادام لے کر اس کی طرف بڑھتی۔ وہ ہونٹوں سے بادام اٹھانے کے بہانے ہتھیلی کو چوم لیتا، چومتا رہتا یہاں تک کہ وہ بڑی سی بیر بہوٹی کی طرح سمٹ جاتی اور وہ پیالہ اٹھا لیتا۔ ایک پیالہ پی کر وہ بوتل بند کرنے لگا۔

"بس"

"آپ بھول گئیں... ہم نے تین پیالے آپ کی قربت پر نچھاور کر دیئے"

"چلئے وہ رکھئے میرزا صاحب جو عمر بھر نبھ سکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تین پیالے تین دیواریں بن کر ہمارے درمیان کھڑے ہو جائیں"

"نہیں ... ہرگز نہیں ہو سکتا"

"جانتی ہوں لیکن میرے اندیشوں کی خاطر ایک پیالہ اور ڈھال لیجئے ... سچ میری گذارش ہے ... آپ کو میرے سر کی قسم"

دوسرا پیالہ بناکر اس نے اپنے سر کے برابر اٹھایا اور "بیگم کے حکم کے نام" کہہ کے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور مسند سے پشت لگا لی۔

"آرزو تھی کہ اپنے ہاتھ سے تمھارے سولہ سنگار اور بتیس ابرن کرتے دنیا جہان میں جتنے لباس ہیں تم پر سجاتے، تمھاری بہار دیکھتے اور ان راجاؤں اور نوابوں اور بادشاہوں پر رشک کرتے جو تمھارے حسن کی سرکار میں باریاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن دلّی سے نکلتے وقت یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ نا مہربان آسمان اتنا مہربان ہو جائے گا۔"

"اگر یہ معلوم ہو جاتا تو کیا کرتے؟"

"جتنا قرض مل سکتا کمر میں باندھ لیتا اور کل متھرا کے بازار میں میرزائی کرتا پھرتا۔"

"بھلا زیادہ سے زیادہ کتنا مل جاتا؟"

"لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"آپ کی آرزوؤں میں شرکت کرنے کے لئے۔"

"ارے ہزار دو ہزار تو لے ہی مرتا۔"

"اتنا قرض تو آپ کو یہیں بیٹھے بیٹھے مل سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

بیگم اٹھیں۔ میلے کپڑے کے بقچے سے ٹاٹ کی سلی ہوئی تھیلی نکالی اور کھول کر مسند پر انڈیل دی۔ اشرفیاں جگر جگر کرنے لگیں۔ وہ مسند سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہمارے قبیلے کے مرد عورت کی گرہ پر عیش نہیں کرتے۔"

"لیکن ساہوکار عورتوں سے بیاج کی در پر قرض تو لیتے ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

بیگم نے آنکھیں نیچی کر کے آہستہ آہستہ مضبوط آواز میں کہا۔

"میں اگاہی پر روپیہ بانٹتی ہوں۔ سیکڑے پر ایک روپیہ ماہانہ سود وصول کر لیتی ہوں۔ بوا سبز قدم کا سب سے بڑا کام یہی ہے۔"

اور بوا ایک آدمی کے ساتھ کھانے کا خوان لے کر آگئیں۔ بیگم نے اشرفیوں پر رومال ڈال دیا۔ بوا نے مسند سے نیچے سیتل پاتی بچھا کر کھانا چن دیا۔ بیگم نے سبز قدم کو خاص انداز میں دیکھا۔

"کیوں بوا میں بیاج پر روپیہ دیتی ہوں یا نہیں؟"

"ہاں بیگم کیوں نہیں دیتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ بیاج ذرا سختی سے وصول کرتی ہیں۔"

وہ ہاتھ دھونے کے لئے اٹھنے لگا تو بیگم نے کرتے کا دامن پکڑ لیا۔

پہلے اس میں سے سو مہریں گن لیجئے۔

تامل کے بعد جب وہ گن چکا تو باقی مہریں تھیلی میں ڈال کر بیگم نے کہا۔

بازار میں اشرفی کا بھاؤ بارہ روپے ہے۔ بارہ سو پر بارہ روپے سود ہوا تو اس میں سے ایک اشرفی سود کی مجھے عنایت کر دیجئے۔ لکھا پڑھی ہوتی رہے گی۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن رومال میں بندھی ہوئی ننانوے

اشرفیاں چرمی تھیلے میں رکھ لینا پڑیں۔ آوازوں کے پرندے اس کے کانوں سے ٹکراتے رہے لیکن وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

صبح کی تبرید کے بعد اس نے دو گرڈی منگوائی۔ بوا کو سامان کے پاس چھوڑا اور بیگم کو پہلو میں لے کر سوار ہو گیا۔ دوپہر کے گجر تک بیگم کی نانا کے باوجود دو کانوں پر میرزائی کرتا رہا۔

سبز قدم اپنی بیگم کے ساتھ خریدے ہوئے سامان کے بقچے بنا رہی تھیں کہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"میاں تھوڑی دیر کے لئے بازار میں بھی جاؤں گی۔"

"ضرور .... جائیے درشن سنگھ سے کہہ دیجئے۔"

"پھر سیڑھیوں پر چاپ محسوس ہوئی۔"

"مہاراج آپ کا پھاٹک پر انتظار کر رہے ہیں۔"

کسی نے اطلاع دی۔

پھاٹک کے بغلی دالان کے قالین پر کنور نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رسمیات کے تبادلے کے بعد اس نے کنور کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دوستی کا جتنا حق تم پر تھا تم نے اس سے زیادہ ادا کر دیا۔"

"میرزا صاحب ... پھر اپنے طرطے مینے اڑانے لگے آپ۔ یہ بتائیے کہ طلب کیوں کیا گیا؟"

"یہ ستاروں سے خوبصورت دن جو تم نے توڑ کر میرے دامن میں ڈال دیئے ہیں، پھر زندگی بھر نصیب ہوں کہ نہ ہوں، اس لئے میں ان سے لذت

کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ یہاں سے آگرے کے بجائے سیکری کے لئے اٹھئے اور باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

"چاہتا تو یہی ہوں لیکن۔"

"لیکن کے منہ پر جوتا۔ آپ عیش کیجئے۔ صرف عیش .... بالا سنگھ۔"

"گھوڑے لگاؤ، درشن سنگھ کو حکم دو کہ ہمرکاب ہو۔"

بارہ دری میں سامنے کے آدھے گاؤ تکئے پر وہ اپنا سر رکھے نیم دراز تھا۔ پشت کے آدھے گاؤ تکیے پر بیگم کہنیاں گاڑے، ہتھیلیوں میں چہرہ رکھے، اس کے بازوؤں پر آدھے آدھے بال پھیلائے سیکری کے سفر کا منصوبہ سن رہی تھیں۔

"آپ تو علاء الدین ہوئے اور آپ کا دوست جادو کا چراغ۔"

اس نے سنہرے سرخ بال دونوں ہاتھوں میں بھر کر آہستہ آہستہ ان کے ہونٹ اپنے ہونٹوں پر جھکا لئے۔ باہر پانی برس رہا تھا۔ نہیں بادل پھٹ پڑے تھے۔ بارہ دری میں اگر بیگم کا چہرہ روشن نہ ہوتا تو اندھیرا ایسا ہو گیا ہوتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔

"ایک بات کہوں؟"

"نہیں دس۔"

"میں رنگین کپڑے صرف آپ کے سامنے پہنوں گی، بوا کے سامنے بھی نہ آسکوں گی۔"

بالوں سے بھری ہوئی مٹھیاں اوپر سے نیچے آنے لگیں اور ہونٹوں پر کلیاں

چٹخنے لگیں۔ آنکھیں ایک دوسرے کو اپنے خوابوں کے خزینے دکھاتی رہیں۔ داد وصول کرتی رہیں۔ سانسیں ایک دوسرے کی خوشبو کا تبادلہ کرتی رہیں اور بدن ایک دوسرے کی آنچ میں تپتے رہے۔ خود فراموش ہو گئے وقت فراموش ہو گئے۔

سیڑھیوں پر بوا کسی سے بلند آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ کھلے ہوئے پھول کی پتیوں کی طرح وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مشعلچی بارہ دری جگمگا کر حوض کی چھتری کی طرف چلا گیا۔ بیگم نے صدر کے فانوس کے نیچے کھڑے ہو کر انگڑائی لی تو جیسے کائنات کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ آنکھیں کھولیں تو بڑے بڑے بیضاوی ہونٹوں پر سیاہ ہیرے کی پتلیاں تڑپنے لگیں۔ خود شراب ساقی کے ہونٹوں کے لمس سے مست ہو گئی، سرمست ہو گئی۔

"بوا تو بہت بھیگ گئیں"

بوا کو ان کے وجود کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے اس نے کہا۔

بھیگ کہاں گئی ..... جوڑھ ہو گئی جوڑھ۔

بوڑھے پادری کی بوتل کھولی تھی کہ درشن سنگھ نے حاضری کی اطلاع دے کر بوا کے ہاتھ میں ایک ڈوری پکڑا دی۔ ڈوری کھلی، بھنے ہوئے مرغ کے ساتھ کیسر کستوری کی بوتل دیکھتے ہی اپنے پیالے سے مٹی کے تیل کی بو آنے لگی۔ بیگم نے بوتل گود میں رکھ کر کنکھیوں سے خاص انداز میں دیکھا۔

"یہ آخر ہے کیا؟"

"کنور نے زعفران کا شربت بھیجا ہے۔ یہ راجپوتوں کا چہیتا مشروب

ہے۔ اس موسم میں بڑے چاؤ سے پیتے ہیں۔"

"میرزا صاحب آپ تو چٹکیوں میں اڑائے لگے ..... یہ تو کھلی ہوئی شراب ہے۔"

"توبہ کیجئے بیگم ..... شراب ہوتی تو ہم مدتوں پہلے ڈھال چکے ہوتے۔ اس طرح سر بہ مہر آپ کی گود میں نہ رکھی ہوتی۔ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے دن میں کسی وقت کام آئے گا۔"

"کنور صاحب تو پیتے ہی ہوں گے۔"

"جی ..... شا کا ہاری ہے پکّا ..... شراب کباب تو بڑی چیز ہے وہ پیاز تک نہیں چھوتا۔"

اور بیگم کے چہرے پر یقین کی روشنی سی پھیل گئی۔

صبح کے ناشتے کے بعد انناس کے خمیرے کے گھونٹ لے رہا تھا کہ آدمی نے حجام کی حاضری کی اطلاع دی۔ اور چھتری کھول کر بڑھا دی۔ وہ سیڑھیوں پر تھا کہ بیگم نے پوچھا کتنی دیر لگے گی اس نے جواب دیا کہ دیر لگے گی اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ پھاٹک تک روش کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے تالاب بن گئے تھے اور ان میں چھم چھم بوندیں گر رہی تھیں۔ دالان میں کھڑی چارپائی کے پاس ایک آدمی میلا کرتا اور تہمد پہنے کندھے پر لال کثیف انگوچھا ڈالے "کسبت" بغل میں دبائے کھڑا تھا۔ حجام کو دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن مجبوراً بیٹھ گیا۔ اس نے کندھے سے انگوچھا آتار کر جو جھٹکا تو بدبو سے دماغ پھٹ گیا لیکن وہ بیٹھا رہا۔ جب لال کپڑا گلے میں باندھنا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔

"تم صرف داڑھی مونڈ دو اور جلدی کرو۔"

اس نے قینچی نکالی تو لگا جیسے آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہو۔ کسی طرح گیسو درست کرا لئے لیکن جب استرہ دیکھا تو روح فنا ہو گئی کہ گوشت بنانے والی چھریوں سے بھی بدتر تھا۔ حجام پوری توجہ اور محبت کے ساتھ چمڑے کے ٹکڑے پر پٹخ پٹخ کرتے رہا تھا اور وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے "کسبت" سے انتہائی گندی کٹوری نکالی اور لپک کر پرنالے کے پانی سے بھر لی۔ اب صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ جیب سے دو پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اس نے جھپٹ کر البٹی میں رکھے اور کسبت میں اپنے ہتھیار دھرنے لگا۔ پھاٹک میں درشن سنگھ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"یہ بھیڑیں مونڈنے والا حجام کہاں سے پکڑوا لیا تم نے ..." اور وہ چھتری کھول کر بارہ دری کی طرف چل پڑا۔ درشن سنگھ کچھ کہتا ہوا ساتھ ساتھ چلا لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔ خالی بارہ دری کے کھلے دروں پہ موم جامے کے پرزے کھلے پڑے تھے۔ اس نے ایک جھری پر آنکھ رکھ دی۔ حوض کے کنارے کھڑے ہوئے مور پنکھی کے درختوں کے اس پار حوض کی جھری میں ایک پرچھائیں چمک گئی۔ وہ باہر نکل آیا۔ خاصی تیز بوندوں میں درختوں کے نیچے نیچے فصیل کے کنارے کنارے ہوتا ہوا چھتری کی پشت پر آ گیا۔ چھتری کے اندرونی فرش اور حوض کے پانی کی سطح کے سنگ تقسیم پر بیگم کا سر رکھا تھا۔ اور ڈھیروں بال کھلے پڑے تھے اور ہلکی ہلکی لہروں پر لرز رہے تھے اور بڑا

ابٹن مل رہی تھیں ۔ وہ چاندنی کی زمیں بوس شاخوں کے درمیان نگاہ کے آیت ایک گوشے کو گل بداماں کئے کھڑا تھا۔ پانی اس کے کرتے کی آستینوں اور پائجامے کے پائینچوں سے ٹپکنے لگا۔ ٹپکتا رہا۔ جب سنگین چھتری کھیڑ کے پردے کی طرح خالی ہوگئی تو وہ بارہ دری کی طرف چلا ہوا چھتری لگائے روش پر چھپر چھپر کرتی پھاٹک کی طرف جا رہی تھیں ۔ باانداز پر قدم رکھتے ہی نگاہ ٹھنک ہوگئی ۔ وہ شفقی رنگ کا جے پوری جوڑہ پہنے بال گوندھ رہی تھیں ۔ آنکھ ملتے ہی بیر بہوٹی ہوگئیں ۔ سچے کام کے چوڑے چوڑے کناروں کے آب رواں کے دوپٹے کی اوٹ اڑسے بولی ۔

"اللہ آپ کہاں سے آرہے ہیں جو اتنا بھیگ گئے ۔"

"کپڑے دے دیجئے ورنہ سارا فرش مٹی ہو جائے گا ۔"

جے پوری چولی کی اونچی سرخ آستین سے تڑپتا ہوا سڈول ، برہنہ ، تندرست بازو کپڑے دینے کے لئے دراز ہوا تو ایک مضبوط پنجے کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگا ۔

آسمان پر بادلوں کا رن پڑنے لگا تھا کہ اندر کی فوج کے ہاتھیوں نے پڑھائی کر دی تھی ۔ بجلی چمک رہی تھی کہ اکھاڑے والیوں کے آنچل ڈھلک رہے تھے ۔ پھاٹک کی سمت کے دروں پر پردے پڑے تھے اور وہ دھواں دھار پانی برس رہا تھا کہ نہ حوض کی چھتری نظر آرہی تھی اور نہ فصیل وہ مسند سے لگا بیٹھا تھا ۔ پاس ہی ستون کا سہارا لیے بیگم نیم دراز تھیں ہفت رنگ کام کی دو دو بالشت چوڑی گھاگھر کی گوٹ سے کچی چاندی کی پنڈلیاں

جھانک رہی تھیں اور ان کے درمیان برسات کو قاتل بنا دینے والا سامان رکھا تھا۔

"کل جو شعر آپ نے سنایا تھا وہ سنائیے .... نہیں پوری غزل سنائیے اور اسی طرح سنائیے جس طرح آپ نے لال قلعے کے مہتاب باغ والے مشاعرے میں سنایا تھا کہ یہاں سے وہاں تک ہو کا عالم ہو گیا تھا۔"

"اچھا اگر ہم آپ کے حکم کی تعمیل کر دیں تو آپ کیا انعام دیں گی؟"

"ہمارے پاس دینے کو ہے کیا میرزا صاحب۔"

"بیگم کفران نعمت اور اتنا۔

اگر اٰں ترک لالہ رخ بدست آرد دل مارا

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

"سمرقند و بخارا اگر آپ کے پاس ہوتے ہوتے تو یہ شعر نہ پڑھتے۔"

"خدا کی قسم اگر سمرقند و بخارا ہمارے پاس ہوتے تو اس طرح پڑھتے جس طرح پڑھنے کا حق تھا۔"

"اچھا خیر بہلائیے نہیں غزل شروع کیجئے۔"

اس نے پیالہ خالی کر کے رکھ دیا اور مطلع چھیڑا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

جب غزل ختم کر کے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ بوا دم بخود بیٹھی ہیں اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی ہیں۔

"میاں میں پڑھی نہ لکھی لیکن اتنا جانتی ہوں کہ آپ کو سن کر کلیجہ وہاں نہیں

رہا جہاں تھا۔"

بیگم نے گردن جھٹک کر پیشانی پر جھکے ہوئے بالوں کو اٹھایا اور نظریں جھکا لیں۔

"ہاں تو بیگم صاحب ہمارا انعام۔"

وہ ہاتھ باندھ کر سائلوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بوا اپنے آنچل میں منھ چھپا کر اٹھ گئیں۔

"بیٹھ جائیے .... ہم نے آپ کو ماں کہا ہے مغل بچے بات پر جان ہار جاتے ہیں۔ دیکھئے بوا آپ کی بیگم بات ہار گئی ہیں۔ ان سے کہئے کہ جو کچھ ہمیں مانگنا ہے آپ کے سامنے مانگنے دیں۔"

"مانگئے۔"

ساتھ ہی گاؤ تکیے کے نیچے سے گھنگھروؤں کا جوڑا نکلا اور بیگم کے پیروں کے پاس چھم سے گر پڑا۔

"ہم آپ کا رقص دیکھنا چاہتے ہیں۔"

بڑی دیر کے بعد بڑے تکلف کے ساتھ لانبی لانبی مخروطی انگلیوں نے گھنگھرو باندھ لیے۔ اٹھیں تو جیسے قیامت اٹھتی ہے۔ دوپٹے کے پلّو کمر کے گرد باندھے تو بدن کے تناسب کے قاتل دریچے کھل گئے۔ گوشت و پوست کے حسین تندرست پاؤں عقاب کے پروں سے بھی ہلکے معلوم ہوتے۔ پورے جسم میں کہیں ہڈی نہ تھی، کہیں جوڑ نہ تھا، کہیں گرہ نہ تھی۔ نہ سارنگی کا زیر نہ طبلے کا بم لیکن کتھک کے مشکل ترین مقامات اس طرح پانی ہو رہے تھے کہ آنکھیں

یقین کرنے سے عاجز تھیں۔ انگلیوں کی مہارت، ابروؤں اور آنکھوں کی جلت پھرت، گردن کی جھٹک، کمر کی مٹک، سینے کی تھرتھری اور کولھوں کی گدگدی اور سب پر آفت وہ ٹھوکر جس کے سامنے ہر تشبیہہ بے نمک اور بے جان چاند پیشانی کا پسینہ ٹھنڈی تارہ ہو گیا لیکن نہ کوئی ادا اوچھی ہوئی نہ انداز بھاری۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر آنکھوں کے پورے ہالے میں ناچ رہی تھیں لیکن آنکھیں پورے بدن کی فنی جنبشوں کی داد سے عاجز تھیں۔ اگر آنکھوں کے وار سے بسمل بھی ہو لیے تو کمر کے خم کی گھات سے محروم رہ گئے۔ دوپٹے کے پلوؤں کی لٹک چولی کے کساؤ کی جھمک اور گھاگھرے کے بھنور۔ ایک دل اور اتنی گھاتیں! اس نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ لیے۔ اور وہ کھڑی ہو گئیں جیسے سب کچھ ساکت ہو گیا۔

"سبحان اللہ بیگم سبحان اللہ۔ کیا راتوں کو اٹھ اٹھ کر ریاض کرتی رہیں۔ مجھ کہن والی کے منہ میں خاک۔ بڑی بڑی تیاریوں میں بھی تو یہ سبھاؤ نہیں ہوتے، یہ سجاؤ نہیں ہوتے، یہ رچاؤ نہیں ہوتے۔" بوا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں اور اس کے ہاتھ کا پیالہ قلقلِ مینا سے ہنسنے لگا۔ اس نے پیالہ سر کے برابر اٹھا کر نعرہ لگایا ؏

"اگر ایں ترک رقاصہ بدست آرد دلِ مارا"

دوسرے دن جب پانی تھما تو اس نے کنور کو خط لکھا کہ سیکری کا سفر تو وصل کی مدت بڑھانے کا ایک بہانہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سیکری کے سفر سے جو دن بچتے ہوں وہ ہم کرشن نگری کی اسی بارہ دری میں کھرے کر لیں۔ شام ہوتے ہوتے سوار جواب لایا کہ سیکری کے سفر کی کھکھیڑ سے ہم خود آپ کو

بچانا چاہتے تھے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہی لکھ دیا۔ ہماری طرف سے یہ بارہ دری آپ کے عیش کے لئے بنائی گئی ہے۔ راجہ ہمارا دوست اور عملہ ہمارے ماتحت ہے۔ بیگم جو سیکری کے خوف سے زرد ہو رہی تھیں۔ اس خبر سے گلابی ہوگئیں۔ بوا گڑھل کے پھول کا شربت بنا رہی تھیں۔

"تینوں گلاس یہیں لے آئیے گا ... اور بیگم ذرا آپ 'کیسر' کا شربت اٹھائیے۔"

اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ بوتل کھول کر گلاسوں کو لبریز کر دیا اور آہستہ آہستہ چسکیاں لینے لگا۔ سیڑھیوں پر مالن پھولوں کے گہنے لئے کھڑی تھی۔ بوا نے ایک روپیہ ہاتھ پر رکھ کر گہنے لے لئے۔ بیگم گہنے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں اور گھونٹ لیتی رہیں۔ اس کو خالی کر کے بوا نے ہاتھ دھوئے اور انھیں پہنانے لگیں۔

"بوا نے مصری کم ڈالی شربت میں۔"

"اے لیجئے بیگم مصری تو برابر کی گھٹی ہے۔ میں تو جانوں اس 'لیسر' کا کچھ قصور ہے۔"

"ہاں کچھ تلخی سی تو مجھے ضرور محسوس ہوئی۔"

اس نے موقع کی نزاکت کا خیال کر کے بیگم کی تائید کی۔ بوا کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ دھوبن نظر آگئی اور وہ دونوں کپڑے رکھنے اٹھانے اور دینے دلانے میں الجھ گئیں۔ دھوبن کے جاتے ہی اس نے بیگم کا ہاتھ تھاما اور حوض کے نیچے ٹہلتا ہوا فصیل کے برج تک آگیا۔ نیچے تاریخ کو اپنی گود میں پالنے

والی جمنا بہہ رہی تھی۔ لہریں اٹھ اٹھ کر انھیں دیکھتیں اور حقارت سے آگے بڑھ جاتیں کہ آج جہاں تم بیٹھے ہو کل یہاں کوئی اور بیٹھا تھا اور کل یہیں کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ وقت کی زندہ شاندار علامت کو وہ دیر تک دیکھتے رہے پہلو میں بیٹھی ہوئی بیگم کا سر ڈھلک کر اس کے شانے پر آ گیا۔

اس نے ہاتھ لگایا تو وہ ٹوٹ کر گود میں آ گئیں۔ یہ شام کتنی خوبصورت ہوتی اگر سر پر جدائی کی تلوار نہ لٹک رہی ہوتی۔ جدائی تو ہر وصل کا مقدر ہے۔ دنیا کی بنائی ہوئی نہ سہی موت کی اتاری ہوئی سہی۔ اس پر صبر آ جاتا ہے۔ اس پر بھی آ جائے گا۔

"بیگم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اور آپ۔"

بیگم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مہتاب باغ کے سفید گلاب سے زیادہ نازک اور زندہ ہاتھ جس کے لمس سے اس کے ہونٹ۔

"دہلی سے سمجھا رہی ہوں آپ کو کہ ہمارے خاندان کی بیوہ شادی نہیں کرتی۔"

"کیا آپ کا خاندان خاندانِ رسالت پناہ۔۔"

"نعوذ باللہ کفر بکنے لگے آپ۔"

"ہم آپ کو سند دے رہے تھے سمجھا رہے تھے۔ آپ سولی کے تختے پر کھڑی ہیں۔ اتر آیئے۔ اپنے لئے نہ سہی ہمارے لئے اتر آیئے۔"

اور اس نے ہاتھ تھام لیا جو ملائم ہوتا گیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے اور بڑی ہوتی گئیں اور قاتل ہوتی گئیں۔ وہ ان کے بدن پر بجھتے ہوئے پھولوں کے

گہنے برابر کرنے کے بہانے اپنی انگلیوں سے بدن کو چومتا رہا اور خاموش بیٹھی رہیں .... رات بدنصیبی کی طرح دبے پاؤں آئی اور چھا گئی۔ حوض کی چھتری تک روشن ہو چکی تھی۔ ستون کے سہارے لگے لگے بوا کی آنکھ جھپک گئی تھی۔ آہٹ پر اٹھیں۔ پھاٹک کی سمت کے پردے گرادیئے۔

"جب کھانا کھائیے آواز دے لیجئے۔"

اور وہ باہر چلی گئیں۔ بیگم اس کے پہلو میں کھڑی نیم باز آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے مسند پر لٹا دیا اور ان کی چوٹی کی گرہیں کھولنے لگا ... رات کے کسی پہر بیگم کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا، پنڈلیاں ان کی گود میں رکھی ہیں اور گھنگھرو بندھے پیروں پر ایک ہاتھ لرز رہا ہے اور دوسرے میں پیالہ چھلک رہا ہے اور پشت گاؤ تکیے سے لگی ہوئی ہے اور نگاہیں ان کے چہرے پر لڑکھڑا رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظریں سمیٹ کر پلکیں ڈھانپ لیں۔

پہلو پہلو مہکتے دن ڈوب گئے۔ کروٹ کروٹ جھمکتی راتیں غروب ہو گئیں۔ اور روزِ حشر آ پہنچا۔ سر پر سورج کھڑا تھا جیسے سوا نیزے پر اتر آیا ہو۔ بیگم اپنے روایتی سیاہ کپڑے پہنے اس کے سینے پر بکھر رہی تھیں۔ پھر اپنی مٹھیوں میں اس کا گریبان پکڑ لیا۔ آنسوؤں سے تربتر آنکھیں اٹھائیں۔ خونِ جگر سے لالوں لال آواز میں بولیں۔

"اب کہاں ملو گے ؟"

اور آبلے کی طرح پھوٹ بہیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نے

ساتھ نہ دیا۔ بوا ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ اس نے اتر کر دروازہ بند کیا اور دوسری شکرم میں اپنے سامان کے ساتھ سوار ہو گیا۔ کنور آنکھیں ملائے بغیر گھوڑے پر بیٹھے تھے۔ ان کے ایڑ لگاتے ہی بیگم کی دو گاڑی ان کے پیچھے اڑنے لگی۔ وہ ہر گوپال تفتہ کے مکان کے بجائے راجہ منڈی کی سرائے میں اتر پڑا۔ خفتان کھونٹی پر ڈالا اور بوتل کھول کر بیٹھ گیا۔ نہ وقت نہ موسم نہ گلاب نہ گزک۔ ایک جھونجھل تھی کہ پیالے پر پیالے انڈیل رہی تھی، اور نشے کا کہیں کوسوں تلک نام نہ تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر زنجیر کھولی۔ آگے آگے کنور پیچھے پیچھے اس کے آدمی اندر آئے اور سامان اٹھانے لگے۔

" ہم سمجھے تھے کہ آپ اپنے آبائی مکان میں اتریں گے اس لیے چپ تھے لیکن سرائے میں اترنا آپ کی نہیں ہماری ناموس کے خلاف ہے۔"

" وہ مکان تو مدت ہوئی پیالے میں گھول کر پی گیا۔ یہ مہاجن کی شرافت ہے کہ میری آمد پر دیوان خانہ کھول دیتا ہے لیکن اس بار میرا ارادہ تفتہ کے گھر اترنے کا تھا لیکن دل کا جو حال ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔"

وہ کبھی کنور کا مہمان نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اترا تو در و دیوار بچھ گئے۔ ایک آبلہ تھا کہ کنور کی ہتھیلی پر رکھا تھا۔ ننھی بیگم سے بالا بائی تک وہ کون سا نام تھا جو قدموں میں پڑا مچل نہ رہا ہو۔ آگرے سے بھرت پور تک کے بازاروں میں کون سی شراب تھی جو یہاں نہ دی گئی ہو لیکن دل تھا کہ تھامے نہ تھمتا، سنبھالے نہ سنبھلتا۔ ایک رات بھری محفل میں اس نے کنور کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا نامہ و پیام کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔"

"کمیدان کی حویلی حویلی ہے میرزا صاحب لال قلعہ نہیں کہ پرندہ پر نہ مارتا ہو اور اس شہر کی مشاطاؤں میں ایسی ایسی علامہ پڑی ہیں کہ تلواروں کے پہرے سے آنکھوں کا کاجل نکال لائیں۔ اُدھر کا حال آپ جانیں، ادھر تو صرف آپ کے حکم کی دیر ہے۔"

"تو کوئی صورت پیدا کرو۔"

"صبح ہونے دیجئے ہر کرن کے ساتھ ایک صورت پیدا ہو گی۔"

اور پیالا اٹھا کر ہاتھ میں دے دیا۔

جدائی کی ہر رات کی صبح دیر سے آتی ہے لیکن وہ صبح تو کئی راتیں ہضم کر کے نمودار ہوئی۔ ناشتہ کر کے پیچوان سے شغل کر رہا تھا کہ کنور ایک سفید برقعے کے ساتھ صدر دالان میں آ گئے۔

"میرزا صاحب یہ ہماری خالہ ہیں ان سے کہئے اور بے دھڑک کہئے۔"

اور برقعے کا نقاب الٹ گیا۔ چہرہ اگر حرفوں کا بنا ہوا تو آنکھیں زیر زبر میں تلی ہوئی۔ اتنے رکھ رکھاؤ سے وہ آ کر بیٹھیں کہ تعظیم پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے تامل پر کنور نے ٹھوکا دیا۔

دیر تک اپنی کہتا رہا وہ سنتی رہیں۔

"بی بی کے مرحوم شوہر کا نام بتا دیجئے۔"

"کیا کیجئے گا جان کر۔"

میاں آپ ڈال ڈال بھٹک رہے ہیں اور میں پات پات سے گذر چکی

آپ نام لیجیے۔

"تیمور جان۔"

آغا سرور جان والے ... پانچ چھ برس پہلے جوالور کی لڑائی میں کھیت رہے۔

"جی ہاں آغا مرحوم کے بڑے بیٹے .... آپ نے صحیح سمجھا۔

مسکرائیں اور اس طرح کہ پورا چہرہ مسکرا دیا۔ آنکھوں تک سے ہنسی کی پھواریں پڑنے لگیں۔ بڑے ٹھٹے۔ سے اٹھیں ایک قدم چلیں تڑپ کر پھریں۔

"میں صدقے میرا بھتیجا کیا ہوا؟"

"حاضر ہوا خالہ جان۔"

کنور کہیں سے لپک کر آگئے۔

"مہمان کو ٹھہرانے کا انتظام کریں مہاراج۔"

"جی۔"

دونوں کے منہ سے ایک ساتھ جیسے چیخ نکل گئی۔

مہمان کے لئے فرش بچھائیے پردے لگائیے، فانوس جلائیے۔ اللہ نے چاہا تو ایک سورج ڈوبنے سے پہلے دوسرا سورج اسی دالان پر چڑھے گا۔"

وہ اپنی پیزاریں پہن رہی تھیں۔ کنور نے دس روپئے ہتھیلی پر رکھ کر پیش کئے۔

"اے نوج میں کوئی کٹنی دلالہ ہوں۔ آپ کا خالہ خالہ کہتے منہ سوکھتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اک بات کہی ہے تو اپنے سفید چونڈے پر سیاہی لگانے اٹھ پڑی۔"

اور برقعہ سنبھال نقاب ڈال لپ جھپ ڈولی میں سوار ہوگئیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

"کیا عورت ہے۔"

"پورے اکبرآباد میں ایک ہے۔"

سورج ڈوبے مدت ہو چکی تھی جب کہیں اللہ اللہ کرکے خالہ کی ڈولی اتری اور ساتھ ہی کنور ہنکارے۔

"سورج کہاں ہے خالہ جان۔"

"توبہ کیجئے مہاراج ... آدھی رات میں سورج کہاں۔ خیر سے صبح ہونے دیجئے ماتھے سورج ٹھڈی تارہ سب کچھ ہو جائے گا۔"

"لیکن کچھ بتائیے تو۔"

"بتائے بھی تو کیا کیا بتائے۔ قصہ کوتاہ بیگم حضرت کے مرحوم شوہر مجھ کم نصیب کے بھتیجے ہیں ایک بہن کی ان کی ماں دوسری کی ہیں۔ تو کیا میرا کچھ بھی حق نہ ہوا۔ پوچھتی پاچھتی پہنچی۔ شادی بیاہ کا گھر۔ کام پر کام لیکن میں جو صورت دیکھتے ہی غش کھا کر گری تو کیسا باورچی خانہ اور کہاں کا توشہ خانہ ساری ڈیوڑھی محلسرا ایک ہوگئی آخر کو طے پایا کہ اصل خیر سے کل دن چڑھے سسرال جائیں گی اور رات تک قیام کریں گی مقرر... آگے کی آگے دیکھی جائے گی اور ایمان کی تو یہ ہے کہ اگر بوا سنبر قدم بیچ نہ ٹیکتیں تو بنتی بگڑ جاتی لیکن اس اللہ کی بندی نے ایسا گرتوں کا سنبھالا ہے کہ کیا کہوں۔ تو صبح امن چین سے ڈولی لاؤں گی لال پردے کی۔

لال پردے پر خود بھی کنور کے ساتھ ٹھاکہ مار کر ہنسیں۔
"اور سرکار چلے آئیں گے۔"
"بندھے ہوئے۔"
"میاں حق تو یہ ہے کہ آپ ابھی چلیں کہ رات ہے کوئی دیکھ بھی لے تو دھندلا لوں گی لیکن دن کی روشنی میں کس کس کی آنکھوں میں دھول جھونکوں گی اور یہ بھی کہ ڈولی سے اتریئے۔"
ذرا سے تامل کے بعد کنور نے کہا۔
آپ چل رکھیئے خالہ یہ ابھی آتے ہیں اور ڈولی ہی سے آتے ہیں۔"
پیادہ ویران سڑک پر ٹھہر گیا۔ سنسان گلی میں چار قدم چل کر کہاروں نے ڈولی رکھ دی تو بوا سبز قدم
"بوا۔"
"اور نہیں یہ آگ طوفان کی عمر یں کیسی کی شادی مرگ کا میرے منہ میں خاک کارن بن جاتی ہیں۔"
دروازہ بند کر شمعدان اٹھا کر آگے بڑھیں۔ چھوٹے سے صحن پر چبوترہ دونوں طرف صحنچیاں سامنے دالان میں اجلی چاندنی کے فرش پر براق بستر لگا ہوا اور.... اس نے گھبرا کر دیکھا تو بیگم کھڑی ہیں۔ ایک دیو پیکر شمع کی قدآدم لو کی طرح روشن ہیں اور بوا سبز قدم بستر کے پائینتی سے اپنی سوزنی اٹھا رہی ہیں۔
"اتنا تیز مت دوڑیئے میرزا صاحب کہ تھک کر بیٹھ جانا پڑے۔

"یہ دن اور رات کے سپید و سیاہ موتی میری تقدیر نے آسمان کی جیب سے کاٹ لئے ہیں۔ ان کو گننے دیجئے، بھنانے دیجئے، عیش کرنے دیجئے۔ سوچنے کو عمر پڑی ہے۔ سوچ بھی لیں گے۔"

صبح ناشتے کے دسترخوان پر سبز قدم بوا کے منہ سے نکلا۔

"خالہ بیگم اگر میرزا صاحب کی موجودگی مشک کی طرح پھوٹ بہی تو کیا کروگی۔"

"اے کروں گی کیا؟ شجرہ تو سونے کے پانیوں سے لکھا ہے۔ شجرہ ہے تو ڈنکے چڑھ کر باج چکا ہے۔ چھاتی ٹھونک کر کہہ دوں گی کہ ہم پشتوں سے میرزا صاحب کے گھرانے کے متوسلین میں رہے ہیں۔ آج سنا کہ میرزا صاحب آگرے آئے اور راجہ منڈی کی سرائے میں اترے اور وہاں سے کنور مہاراج اٹھالے گئے تو ہم کنور صاحب سے خدمت کرنے کو مانگ لائے چار دن کے لئے۔ کوئی جواب ہے تمھارے پاس بہن سبز قدم۔"

بیگم نے اشرفی رومال میں رکھی اور خالہ جان کی طرف بڑھا دی۔

خالہ جان باورچی خانے کی کمی بیشی دیکھ لیجیے۔

"اے توبہ بیگم آپ میری دہی اور یہ داماد۔"

"اور میں دکھیاری تم تینوں کی ماما۔"

"خدا نہ کرے، آپ ہماری بہن ہیں ... یا جی بیگم ہیں۔"

"نہیں جان۔ یہ آپ کے داماد کی منہ بولی اماں ہیں۔"

بیگم نے ان کو ٹوک دیا اور وہ پلٹ گئیں۔

"میں کو کھ جلی اس قابل کہاں کہ دہی داماد کا سکھ دیکھوں یا سب کچھ

تھا یا اب کچھ نہ رہا۔ جھاڑ دیکھ گئی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس جھونپڑے کے علاوہ ایک مکان اور بھی ہے ایک دکان بھی ہے اور میں اکیلی جان کتنا کھاؤں اور کیا پہنوں۔ کنور مہاراج کے تصدق میں آپ آگئیں تو ذرا رونق ہوگئی نہیں تو اکیلی بیٹھی کوڑے ہڑایا کرتی۔ جب کبھی دلی آؤں گی حساب کر کے کھانے کھلا دیجئے گا۔"

اشرفی کا رومال اس کے قدموں میں رکھ کر باورچی خانے چلی گئیں۔

محبت کی بھوکی ہے اور لکھیاری بھی ہے

"مگر ہے چلتر۔"

ہوا نے برف کی طرح ٹھنڈے لہجے میں کہا بیگم ادھر دیکھنے لگیں۔

"جیسی بھی ہے ہمارے کام آئی ہے اور ہمارے کام کی ہے۔"

لیکن بیگم سوچتی ہی رہیں۔ سینر قدم باورچی خانے میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہیں اور وہ بیگم کے سامنے اپنی راتوں کے کانٹے نکالتا رہا۔ وہ کھانستی کھنکارتی آئیں۔ اس کے سامنے پیچوان لگا کر مڑنے لگیں تو روک لی گئیں۔

"خالہ جان ایک بات کہوں۔"

"فرما دیجئے میاں۔"

"اکبر آباد بہت رہ لیں آپ۔ اب ہمارے شاہجہاں آباد چلئے۔"

"شاہجہاں تو میری کھوپڑی پر سو رہا ہے۔ اسے چھوڑ کر اس کے برباد آباد میں جا کر کیا کروں گی۔ ہاں اگر آپ کے کام آسکوں تو کھال اتار دوں جوتیاں بنوا لیجئے۔"

اور وہ چلی گئیں۔

"بیگم سے جو ہم کہیں گے کریں گی۔"

"جیسے آج تک جو آپ نے کہا ہے وہ نہیں کیا ہے۔"

"خالہ جان ہمارے ساتھ چلیں گی۔"

"مقرر چلیں گی۔"

تین دن اور تین راتیں گزر گئیں اسے چاند سورج نے نہیں دیکھا تو بیگم شانے پر سر رکھ کر بیٹھ گئیں۔

"آپ گھبرا گئے ہوں گے ... جائیے کہیں ٹہل آئیے۔"

"ہم وہ پیاسے ہیں کہ اگر آپ سمندر ہوتیں تو بھی پی جاتے۔ آپ تو شبنم کی طرح نصیب ہو رہی ہیں۔ چھوڑ کر اٹھنے کے خیال ہی سے دل بیٹھنے لگتا ہے۔"

بیگم تاروں کی چھاؤں میں دولھن کو وداع کر کے آئیں تو اسے ٹہلتا پا کر جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ پھر اس کی گردن کا ہار ہو گئیں۔

"شادی سے بھرا گھر اب گھومنے نکلے گا۔ ہم کہاں منہ چھپاتے پھریں گے۔ آپ کہاں تک اس چوہے دان میں بند رہیں گے۔ میری مانئے تو اللہ کا نام لے کر تیاری کیجیے۔"

"ہم آپ کے ساتھ تاج محل دیکھے بغیر چلے جائیں تو شاعر نہ ہوتے بنیارے ہوتے۔"

"اللہ ابھی اس روز تو دیکھ چکے ہیں تاج محل ساتھ ساتھ۔"

"اس روز کا دیکھنا بھی کوئی دیکھنا تھا کہ تاج محل کا گنبد جھک جھک کر دیکھ رہا تھا اور چاروں مینار اپنے ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہے تھے کہ ایک چلتے پھرتے آفتاب کا نقاب اٹھ جائے تو وہ سرفراز ہو جائیں لیکن نقاب تھا کہ غازے کی طرح چمٹا رہا۔"

رات کی چوٹی کمر پر لوٹ رہی تھی جب وہ تاج کے دروازے پر اترا۔ پھاٹک بند ہو چکا تھا مشعل جل رہی تھی۔ کنور کے چوبدار نے دربان کی ہتھیلی چمکائی اور دروازہ کھل گیا۔ پورے چاند کی روشنی میں چاندی کے پہاڑ کی طرح جگمگا رہا تھا۔ صدر عمارت کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے وہ اس پر جھول گئیں۔

"ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہاں حسن بے پناہ سے ڈر بھی لگتا ہے۔ حسن مطلق یعنی خدا کی ایک شان جلال بھی ہے۔ جمعدار اپنے پیادوں کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ جمنا کے رخ پر پہنچ کر اس نے برقعہ اتار کر پھینک دیا اور پورا چمن کا چمن باہوں میں سمیٹ لیا۔"

"اگر شاہجہاں کی روح آجائے۔"

"تو ہم ایسا قصیدہ پڑھیں کہ صائب اور کلیم کی عمر بھر کی کمائی ہرزہ سرائی معلوم ہونے لگے۔"

"آپ کو ڈر نہیں لگے گا۔"

"ضروری نہیں کہ چھوٹے بادشاہ بڑے بادشاہوں سے ڈر ہی جائیں۔"

"چھوٹے بادشاہ"

"ہاں شاہجہاں ملک ومال کا بڑا بادشاہ تھا۔ ہم حرف ولفظ کے چھوٹے سے بادشاہ ہیں ؂

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کمال کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں"

"یہ شعر آپ ہی کا ہے؟"

"شعر نہیں حقیقت ہے اور اس پورے عہد میں صرف ہماری حقیقت ہے۔ ردیفوں کی بھیڑیں چرانے والے اور قافیوں کے بتاشے بنانے والے ہمارے منھ آتے ہیں اور اپنی سنہری بیساکھیوں کے سہارے ہمارے کندھوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم شعر نہیں لکھتے ہیں بیگم اندھوں کے سامنے موتیوں کے ڈھیر لگاتے ہیں اور بہروں کے سامنے بلبلوں کو سبق پڑھاتے ہیں۔ پوری دلّی کیا پورے ہندوستان میں ایک مومن خاں ہے جو شعر کہنا جانتا ہے اور غزل سرانجام کرتا ہے لیکن قصیدہ لکھنے سے عاجز ہے باقی کسی کے یہاں شاعری ریاست کا طرہ ہے اور کسی کے یہاں سیاست کا دم چھلاّ اور کسی کی دستار فضیلت کا شملہ .... آپ جب دل پر ہاتھ رکھ دیتی ہیں تو لگتا ہے کسی نے زخم پر مرہم رکھ دیا ورنہ اک عمر ہوئی کہ تنگ باشیوں کے انداز دیکھ رہے ہیں۔ یہ گنبد پر چاند دیکھئے جیسے کسی نے جنگ اڑا کر بیچ آسمان پر سادھ لیا ہو۔ اگر اس مسجد اور مہمان خانے کی عمارتیں کہیں اور ہوتیں تو لوگ منزلوں پر منزلیں مار کر دیکھنے آیا کرتے لیکن تاج کی آب وتاب کے

سامنے بجھ کر رہ گئیں جیسے آپ کے پہلو میں ہمارے سارے غم دھندلا کر رہ گئے۔

"ادھر سیڑھیوں کی طرف چلئے۔"

"بیگم اگر ایک طرف تاج ہو اور دوسری طرف آپ تو ہم تاج کو چھوڑ کر آپ کو تھام لیں۔"

"اس لئے کہ تاج آپ کا ہو کر بھی آپ کا نہیں ہو سکتا جیسے تاج ممتاز کا ہو کر بھی ممتاز کا نہیں شاہجہاں کا ہی رہا۔"

"جیسے آپ ہماری ہو کر بھی ہماری نہیں ہیں۔"

"ہم نے سنا تھا کہ آپ کی حویلی میں آپ کی بہن آپ کی تنہائی کی وجہ سے رہتی ہیں۔"

"درست ہے۔"

"تو آپ حویلی کرائے پر اٹھا دیجئے اور قدیمہ مسجد کے پاس ایک مکان خالی پڑا ہے، وہ لے لیجئے اور بوا اور خالہ جان کے ساتھ آزادی سے رہئے۔"

"میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ بہت تیز دوڑ رہے ہیں۔ میں ایسا آبگینہ ہوں جس پر بال پڑا ہوا ہے۔ ایک ذرا سی ٹھیس میں چور چور ہو جاؤں گی۔ رہا مکان تو اس میں بسنے کے لئے حویلی کو کرائے پر چلانے کی ضرورت نہیں۔"

اور اس نے ہاتھوں کے کنول آنکھوں پر رکھ لئے۔

"اللہ آپ دیکھ رہے ہیں تاج رنگ بدل رہا ہے۔"

"ہاں تاج رنگ بدلتا ہے ... لیکن ہم نے تاج کو تقدیر بدلتے دیکھا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"جب مہاراجہ سورج مل نے آگرہ فتح کیا تو ہندوؤں کے مولویوں نے فتویٰ دیا کہ "برج راج" آگرے سے سیکری تک تمام عمارتیں توڑ کر اورنگ زیب کی مندر شکنی کا انتقام لے لے۔ جب مہاراجہ ٹس سے مس نہ ہوا تو درباریوں نے حکم لگایا کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کا دستور رہا ہے کہ اگر مسلمان فرمانروا کا بھی ملک فتح کیا تو مفتوحہ عمارتیں توڑ پھوڑ کر پھینک دیں اور انھیں کے ملبے سے خود بدولت نے اپنی عمارتیں کھڑی کر لیں۔ آپ بھی تاج محل کو توڑ کر بھرت پور میں سورج محل کھڑا کر لیجئے۔ مہاراجہ نے ان کی تسلی کے لئے کچھ کیا تو اتنا کہ تاج محل میں بھوسہ بھروا دیا لیکن اس کے احساسِ جمال نے تاج محل کو توڑنے کی اجازت نہ دی ورنہ مغل ہندوستان کی کتنی حسین ترین عمارتوں کی تقدیر بدل گئی ہوتی۔"

"مگر میں نے کبھی کسی کی زبانی یہ واقعہ نہیں سنا۔"

"ہاں بیگم جب قوموں پر زوال ہوتا ہے تو نہ صرف وہ خود بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی سے محروم ہو جاتی ہیں بلکہ دوسروں کے بڑے بڑے اور مبارک کاموں کا ذکر کرتے ہوئے بھی ڈرنے لگتی ہیں۔ زوال ہم پر مسلط ہو چکا ہے اور ہم زوال کی اولاد ہیں۔ اکبر آباد سے جہان آباد تک ایک پڑھا لکھا مسلمان دکھلا دیجئے جو راجہ کو سورج مل جاٹ نہ کہتا ہو اور

جاٹ کہہ کر وہ صرف راجہ کو راجگی سے محروم ہی نہیں کرتا بلکہ اسے جاٹ گردی کی علامت مان کر ایک طرح سے نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے ... ویسے اس وقت تاج آپ کو دیکھ کر شرم و ندامت سے رنگ بدل رہا ہے۔"

ابھی آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے کہ خالہ جان کے سامان کے چھکڑے پر بوا سوار ہو گئیں۔ رتھ میں وہ تینوں بیٹھ گئے۔ آگرے سے باہر نکلتے ہی بوا سامان کے چھکڑے سے اتر کر رتھ میں سوار ہو گئیں اور وہ دونوں شکرم میں سوار ہو گئے اور کوچ و قیام کا آموختہ پڑھتے سب ساتھ ساتھ دہلی میں داخل ہو گئے لیکن اس طرح کہ وہ شکرم میں تنہا تھا اور اس کا دل رتھ کے پردوں کے پیچھے دھڑک رہا تھا۔

چار دن گذرے تھے کہ محل سرا سے بی وفادار ہانپتی ڈھانپتی آئیں اور خبر دی، جے پور سے آپ کی خالہ جان آئی ہیں۔ وہ آرام پائیاں گھسیٹتا پہنچا تو دیکھا کہ صدر دالان میں مسند پر ڈھیر خالہ جان ہچکوں ہچکوں رو رہی ہیں اور بھولی بھالی امراؤ بیگم بھی جا رہی ہیں، رلائی جا رہی ہیں۔ چاروں طرف عورتوں بچوں کی ٹٹیاں لگی ہیں۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہے۔ گلے شکوے سے چھٹی پائی تو بڑی منتوں سے دسترخوان پر بیٹھیں لیکن چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ خون کے جوش نے ایسا اندھا کیا کہ قفل کنجی تک کا ہوش نہ رہا اور ہزاروں کا سامان گھر میں کھلا چھوڑ کر سوار ہو گئیں۔ پھر کسی طرح بٹھائی گئیں۔ دو چار نوالے حلق سے اتار کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈیوڑھی پر ڈولی کھڑی تھی۔ اٹھ کر برقعہ پہنا۔ گلے میں پڑا بٹوہ کھول کر ایک اشرفی نکالی اور امراؤ بیگم کی مٹھی میں دبائی۔ عورتوں

میں روپیے بانٹے۔ دالان سے اترتے اترتے کھڑی ہوگئیں۔
" دولھن بیگم تم سے کہنے کو ہیاؤ نہیں کہ جب رم جھم لوں گی تب اصل خیر سے تم کو بلاؤں گی تھال لگاؤں گی مانگھ بھروں گی کہ بہو بیگم ہو لیکن یہ میری ہڈی ہیں، میری آنکھوں کا نور ہیں۔ ان کو اجازت دو کہ مجھ کو کھ جلی کو گھر تک چھوڑ آئیں۔"

امراؤ بیگم تو ایسی بے حواس ہوئی تھیں کہ اگر انھوں نے جے پور تک جانے کو کہا ہوتا تو بھی وہ کھڑے کھڑے امام ضامن باندھ دیتیں۔ بیگم کے اصرار پر اس نے ہوا دار لگانے کا حکم دے دیا۔

اچھا خاصا بھاری بھرکم سجا سجا بھرا بھرا مکان تھا۔ چبوترے کے کونے پر انار کے نیچے بوا سبز قدم بیٹھی لیکھیں ٹٹول رہی تھیں۔ گھبرا کر اٹھیں اور دوپٹہ اوڑھنے لگیں۔

" کمال کی ہو باجی بیگم کہہ گئی تھیں چراغ جلے آنے کو اور اتر پڑیں دن دہاڑے۔"

" اے بیگم سنا تھا لوہارو کی بیگم ہے لوہا لکڑ ہو گی لیکن وہ تو موم کی گڑیا نکلی۔ ایک ہائے کی گرمی سے پگھل گئی۔ آنسوؤں کے دو چھینٹوں میں بہہ گئی تو میں اپنی بیگم جان کو اور انتظار کیوں کراتی۔"

اور برقعہ اتارتے اتارتے شربت بنانے لگیں۔ ایک گھونٹ لیا تھا کہ بیگم نکل پڑیں۔ سپید ریشم کا مرجیں مارتا کرتا۔ نیچے پہنا ہوا پاجامہ اوپر چنا ہوا دوپٹہ اور شانوں پر بھڑکتی ہوئی آگ کی لپیٹیں۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"آپ تو تاج محل کی طرح رنگ بدلتی ہیں اور ہم کہ یوں ہی کہاں کے دانا تھے اور سودائی ہوجاتے ہیں۔"

آج پہلی بار بیگم کے چہرے پر وہ اطمینان نظر آیا تھا جسے دیکھنے کو ترس رہا تھا جیسے وہ فیصلہ کر چکی ہوں۔ خوبصورت اور اٹل فیصلہ۔

"دسترخوان لگاؤ۔"

"نہیں ہم تو کھا پی کر آئے ہیں۔"

"سن رہی تھی لیکن ذرا سا شریک ہوجائیے۔"

دن آفتاب تھے اور راتیں ماہتاب۔ نہ کسی رنج کا سایہ نہ کسی فکر کی پرچھائیں۔ پڑھنے کو داستانیں موجود۔ لکھنے کو غزلیں حاضر۔ شامیں ایسی جشن کہ جمشید دیکھ لے تو زہر کھالے۔ پردے کے ادھر ہوا سبز قدم کے ہاتھ میں اک تارہ تڑپ رہا ہے اور پردے کے اُدھر بیگم کہ جہاں بیگم کا خطاب بھی جھوٹا معلوم ہو اک گھنگھرو میں سرتال کی گرہیں باندھے مچل رہی ہیں، ابل رہی ہیں، مست ہوئی جا رہی ہیں، مجسم رقص ہوئی جا رہی ہیں، اپنے آپ سے گزری جا رہی ہیں اور ہاتھ کا پیالہ جام جم ہوا جا رہا ہے اور آنکھیں خواب تک دیکھنے سے عاجز ہو چکی ہیں کہ آسمانوں میں بربادی کے مشورے ہونے لگے۔

وہ محلسرا کے دسترخوان سے اٹھا تھا کہ امراؤ بیگم پاس آ کر کھڑی ہوگئیں۔

"اتنی تاریخیں ہوگئیں پنشن نہیں آئی۔ نوکر چاکر الگ بلک رہے ہیں۔ جنس الگ ختم ہونے والی ہے۔ محل سے خبر آئی ہے کہ نواب ابھی دس بیس دن فیروزپور سے نکلنے والے نہیں۔ میں تو جانوں آپ اللہ کا نام لے کر سوار ہو جائیے ہاتھ کے ہاتھ وصول کر لیجئے اور آگے کے لئے ایسا انتظام کر لیجئے کہ دلی میں اور وقت پر مل جایا کرے۔"

وہ بیسن سے ہاتھ دھو رہا تھا کہ بی وفادار خبر لائیں۔

"کل سُبو (صبح) فجر کے وقت ہاتھی فیروزپور جائیں گے نواب کا حکم آیا ہے۔"

بیگم نے ہاتھ سے بینی پاک لے کر فیصلہ سنا دیا۔

"میں خط لکھتی ہوں ابا جان کو کہ آپ انھیں ہاتھیوں سے سوار ہو رہے ہیں۔"

"بیگم آپ غالب کی بیوی ہیں کہ نادر شاہ کی؟"

"اس لئے کہہ رہی ہوں کہ کھڑی سواری ملے گی اور پورا لشکر کا لشکر ساتھ ہوگا۔ دل مطمئن رہے گا۔"

فیض بازار میں ہوادار چھوڑا۔ دروازے پر دستک دی۔ بوا نے ہاتھ پہچان کر دروازہ کھول دیا۔ صدر دالان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ روشنی کے گلاس جل رہے تھے۔ صدر کے فانوس کے نیچے بیگم چوڑے چوڑے سنہرے کنارے کا اودا دوشالہ اوڑھے مسند سے لگی بیٹھی تھیں۔ سامنے لگن میں رکھی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگاروں کی دمک سے چہرے

پرچھائیاں چھوٹ رہی تھیں جیسے اودی چینی کی زرکار بیٹھک پر گلابی گلوب روشن ہو۔ سامنے قلمدان رکھا تھا۔ دوسری طرف خالہ جان چاندی کا پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ اس کو دیکھ کر ڈھکنا بند کر دیا اور ہٹ گئیں۔

"ابھی سے انگیٹھی خیر تو ہے۔"

"آج صبح سے سردی سی لگے جا رہی ہے بوانے بنا دی تو رکھ لی۔"

اس نے زانو پر سر رکھ دیا اور فیروزپور کے سفر کا مسئلہ پیش کر دیا۔ وہ جیسی بیٹھی تھیں بیٹھی رہ گئیں۔ پیالہ بنا، دسترخوان لگا، حقہ بھرا مگر وہ ویسی کی ویسی رہیں جیسے اپنا بدن چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی ہوں۔ اس نے دونوں باہوں میں سمیٹ کر مٹھیوں میں بالوں کو بھر کر ہونٹ اپنے ہونٹوں کے پاس کھینچ لئے۔

"اگر معلوم ہوتا کہ آپ اس طرح سنیں گی تو آپ کے کان میلے نہ کرتا۔"

"کان تو بے چارے ڈاکئے ہیں۔ دل غریب پر جو گذرنا تھی گذر گئی۔ کاش آپ کل رک جاتے، پرسوں چلے جاتے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"خدا نہ کرے کوئی خاص بات ہو۔ لیکن تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے ہو کر رہے گا۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ فرمائیں گی ویسا ہی ہوگا لیکن مجھے جانے ہی دیجئے۔ آندھی کی طرح جاؤں گا، پانی کی طرح آؤں گا۔"

پھر دونوں کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ رہا، کچھ بھی نہ بچا۔ البتہ آنکھیں

آنسوؤں کی زبان میں کچھ کہتی رہیں کچھ سنتی رہیں۔

"آپ کو میرے سر کی قسم سچ سچ بتائیے کیا ماجرا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں میاں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جب بی ماندہ ہوتا ہے تو پیاروں کا بچھڑنا سب کو برا لگتا ہے۔"

بوا سامنے کھڑی تسلی کی باتیں کر رہی تھیں۔

"راز کا پیالہ لبوں تک پہنچ چکا ہے۔ ذرا سی لغزش سے چھلک سکتا ہے ورنہ ہم ہرگز سوار نہ ہوتے۔"

فجر کی اذان ہوتے ہی امراؤ بیگم نے امام ضامن باندھ کر ہاتھی پر سوار کر دیا کشمیری دروازے پہنچا تھا کہ سیاہ پردے سے بندھی فنیس کے پاس کھڑے دونوں برقعوں نے نقاب الٹ دیئے اور ہاتھ اٹھا دیئے تو جیسے ترک بیگم کا جنازہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سفید سوتی کپڑوں کی سفیدی اور پردے کی سیاہی اور سب سے بڑھ کر ان کی ہولناک خاموشی۔ اس کی پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ بیگم نے ایک اشرفی کا امام ضامن باندھا۔ سو اشرفیوں کا توڑا خفتان کی جیب میں ٹھونسا۔ داہنے ہاتھ کی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی اتار کر چھنگلیا میں پہنائی اور دیر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی رہیں۔ پھر اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ گردن کے خم سے الوداع کا اشارہ کیا لیکن وہ پردہ پکڑے کھڑا رہا۔ پشت پر بوا نے ہاتھ رکھ دیا۔

"ایک بار اپنی آواز سنا دیجئے۔"

"مردوں سے ایسی فرمائشیں نہیں کی جاتیں۔"

اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر پھپکنے لگیں۔

بوا نے ہاتھ سے پردہ چھوڑا دیا اور وہ ہاتھی کی سولی پر چڑھ گیا۔

فیروز پور اترا تو آوازیں ہونٹوں پر انگلی رکھے پنجوں کے بل چل رہی تھیں۔ آنکھیں پیشانیوں پر چڑھی جا رہی تھیں اور ابرو منہ سے منہ ملائے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ نواب احمد بخش خاں والی لوہارو و فیروز پور جھرکہ اچانک بیمار ہو گئے تھے۔ طبیب ابلہ تیمار دار ملازم بے بس اور مریض گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ فینسیں لگ رہی ہیں، پالکیاں اٹھ رہی ہیں، ہوادار آ رہے ہیں، تام جھام جا رہے ہیں، سوار ایچی بنے گھوڑوں کی مکھیاں اڑا رہے ہیں اور پیادے الف بنے کھڑے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ نواب زادے شمس الدین خاں پورب تو نواب زادے امین الدین خاں پچھم اور وہ کھڑا پچھتا رہا ہے کہ جن حالات میں اور جس کام کے لئے نکلا ہے اس کا سر انجام ہونا تو ایک طرف ملاقات کی تقریب اور بات کی صورت تک نظر نہیں آتی۔ نہ قیام رکھنے میں لذت اور نہ سوار ہونے کی ہمت کہ امراؤ بیگم کو منہ دکھانا ہے آخر۔ اسی مخمصے میں دو دن اور تین راتیں تمام ہو گئیں آخر دہلی کے شریف خانی حکیم گھوڑے سے اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرض کو باندھ کر ڈال دیا۔ لیکن مریض اتنا ہلکان ہو چکا تھا کہ پورا ایک جملہ بولنے کی اجازت نہ تھی تین دن اور بسر ہوئے خاص الخاص لوگوں کو عیادت کی اجازت ملی تو وہ بھی تیار ہو کر نکلا کہ آخر دامادی کا طرّہ لگا تھا۔ محل کی سیڑھیوں پر قدم ہی دھرا تھا کہ نواب

زادے شمس الدین خاں دیوار بن کر حائل ہو گئے۔ آنکھ ملتے ہی بندوق کی طرح تن گئے طمنچے کی طرح چھوٹ گئے۔

" ابھی سرکار کو حکم احکام کی اجازت نہیں ہے روپئے کی وصولیابی کسی اور وقت پر اٹھا رکھئے۔"

" لیکن ہم تو مزاج پرسی کے لئے۔"

" مزاج پرسی تقاضے کی تقریب بن جاتی۔"

" تقاضہ حق کے لئے کیا جاتا ہے خیرات کے لئے نہیں۔"

نواب زادے کے ابرو سرو ہی ہو گئے اور منھ سے دوسری گولی نکلی۔

" جب منشی متصدی پیش ہوں گے آپ کو اطلاع کرا دی جائے گی۔"

اور کڑی کمان کے تیر کی طرح نکل گئے۔ وہ جہاں تھا شرم سے وہیں گڑ کر رہ گیا۔ دور پاس کھڑے ہالی موالی اپنی آنکھیں اسی پر گاڑے ہوئے تھے اور نگاہوں سے تھوک رہے تھے۔ وہ سوار ہونے کے لئے کمر باندھ رہا تھا۔ امراؤ بیگم اپنے باپ نواب الٰہی بخش خاں معروف کا سہارا بنی پالکی سے اتریں تو نواب پہلی ہی نظر میں بیمار نظر آئے۔ اس نے مجبور ہو کر کمر کھول دی۔ شام ہوتے ہوتے کھلبلی مچ گئی۔ نواب کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔ چار دن بعد ان کو دلّی منتقل کرنے کا انتظام ہو سکا۔ وہ بھی سب کے ساتھ بندھا چلا آیا۔ امراؤ بیگم اپنے پورے کنبے سمیت دلّی کے لوہارو ہاؤس میں اتر پڑیں۔ گھنٹوں بعد وہ اپنے گھر کے لئے اٹھ رہا تھا کہ خسر نواب الٰہی بخش معروف سے آنکھ مل گئی۔ وہ ہاتھ باندھ کر ان کی خواب گاہ

تک چلا گیا دفعتاً ان کا ہاتھ مس ہوا تو انگلیاں جل گئیں ۔ وہ بخار میں پھن رہے تھے لیکن بڑے بھائی کی علالت سے چپ لگائے بیٹھے تھے ان کے انکار کے باوجود وہ ساری رات ان کی خدمت میں رہا۔ صبح کے جوان ہوتے ہی مٹکاف صاحب بہادر کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ سرخ کوٹ پر نکٹائی لگائے دھاری دار پتلوم پر بوٹ ڈاٹے بغل میں ٹوپی دبائے گاڑی سے اس طرح اترا جیسے حاکم اپنے غلاموں کے گھر اترتا ہے ۔بے تکلفی میں بھی ایک تکلف انکساری میں بھی ایک تکبر، شہزادوں کی طرح ابروؤں کی جنبش سے سلام قبول کرتا، قالینوں کو روندتا سیدھا نواب احمد بخش خاں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مبارکبادیوں کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ شمس الدین خاں فیروزپور جھرکہ کے جو ریاست کی جان تھا۔ نواب ہو چکے تھے اور امین الدین خاں کو لوہارو کی جاگیر میسر ہو چکی تھی ۔ سارے وظیفہ خوار اور گذارے دار اور پنشن خوار نئے نواب شمس الدین خاں کے محتاج ہو چکے تھے ۔اس کے پیروں کے نیچے کی زمین ہلنے لگی ۔ نواب احمد بخش خاں سے اس کی نفرت اور شدید ہوگئی ۔ پہلے اس کے دس ہزار سالانہ کے وظیفے کو اپنی چلت پھرت اور اثر ورسوخ سے پانچ ہزار سالانہ میں تبدیل کرایا۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو اس پانچ ہزار سالانہ میں بھی ایک فرضی نام خواجہ حاجی کا ٹانک دیا اور نصف کا حصہ دار بنا دیا ۔ باسٹھ روپئے مہینے کا ٹھیکرا بچا تھا تو اسے بھی نواب شمس الدین کی جوتیوں میں ڈال دیا ۔ وہ گذرتی نذروں اور اترتی سلامیوں کے طوفان میں تنکے کی طرح لرز رہا تھا کہ نواب الٰہی بخش

کھڑے ہوکر جبغہ پہننے لگے۔

چلئے میرزا نوشہ نئے نواب کو مبارکباد دیجئے۔

نواب الٰہی بخش کے بوڑھے چہرے کے نقوش فکر سے دھندلے اور بیماری سے سمٹے ہوئے تھے لیکن آواز میں سیاسی دوراندیشی کی چمک قائم تھی۔ وہ ادب میں چند قدم ان کے ساتھ چلا لیکن برادر نسبتی علی بخش خاں کو دیکھتے ہی نواب سے سبکدوش ہوگیا کہ بڑا رشتہ چھوٹے رشتے کو نگل لیتا ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے آنسوؤں کے ہار پرو کر ظالموں کی گردنوں میں ڈالتے ہیں اپنے زخموں کو پھول کہہ کر نذر میں گذار دیتے ہیں۔ دنیا ان کی ہے میرزا نوشہ اور یہ دنیا کے ہیں میرزا نوشہ۔ یہ جاگیرداری نظام کے آداب ہیں، قانون ہیں۔ ان کے خلاف آواز اٹھائی جاسکتی ہے لیکن اس نظام کے خوشامدیوں کے نقار خانے میں کون سنے گا۔ آواز وہ سنی جاتی ہے جسے بازار میں بھنایا جاسکے اور عیش کا تمسک لکھا سکے۔ وہ پھاٹک سے نکل کر ترک بیگم کے مکان کی طرف چلا تھا لیکن جب ہوش آیا تو اپنے دیوان خانے کے سامنے کھڑا تھا۔ حجام اور حمّام سے فرصت پاکر ہوا دار پر بیٹھ رہا تھا کہ داروغہ نے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بے ہوش ہوجانے کی خبر دی۔ ان کے پلنگ کے چاروں طرف بڑے نواب کے حکیموں کی نورانی صورتیں ہجوم کئے ہوئے تھیں۔ دوائیں تجویز ہو رہی تھیں۔ تسلّی کی خوراکیں دی جارہی تھیں لیکن آنکھیں کسی اور ہی بات کی چغلی کھا رہی تھیں۔ بڑے بھائی کی روح چھوٹے بھائی کی بیماری پر صدقے

کی چڑیا کی طرح قربان ہوگئی لیکن چھوٹا زندہ نواب بھائی اپنے مُردہ بھائی کی بے آسرا اولاد کو پُرسے کے چند رسمی فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ دے سکا۔ چہلم تک کا انتظار کئے بغیر نواب شمس الدین کے جشن گدّی نشینی کا قانونی اعلان ہوگیا۔ تاریخ مقرر ہوگئی۔ وہ جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور سن رہا تھا اور چپ تھا کہ نواب الٰہی بخش معروف نہیں مرے گئے اس کے زخموں کی پوشاک کا رفوگر مرگیا تھا۔ اس کے دسترخوان کا وسیلہ اٹھ گیا تھا۔ وہ ہاتھ سوکھ گیا تھا جس کی طاقت پر اس کی کلاہ کج تھی۔ وہ آنکھ بند ہو چکی تھی جس کی شفقت اس کے گھر کی روشنی تھی۔ ان کو زمین کا پیوند کر کے وہ ترک بیگم کے مکان کی طرف چلا۔ دستک پر دستک دی لیکن کوئی آہٹ نہ تھی۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو قفل لٹک رہا تھا۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پیروں میں جیسے کسی نے میخیں ٹھونک دیں۔ معلوم نہیں کیسے اور کب اپنے گھر پہنچا۔ بچی کھچی رات ٹہل کے گذار دی۔ صبح کی روشنی کے ساتھ وہ پھر اسی دروازے پر کھڑا تھا۔ دیر کے بعد کسی نے خبر دی کہ بیگم کے انتقال کے بعد..... اور وہ سر سے پانوں تک سن ہو کر رہ گیا۔ وہ دن حشر کا تھا اور رات قیامت کی، دل زار و نزار، دماغ تار تار کچھ سوچتے بنتا نہ کچھ سمجھ میں آتا۔ بیگم کی بعد از مرگ رسوائی کے خوف نے جیسے سہارا دیا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن افتاں و خیزاں چلتا رہا۔ بلّی ماروں میں بیگم کی حویلی کی ڈیوڑھی پر پہنچا تھا کہ بوا سبز قدم نے ایک طرف سے نکل کر برقعے کی نقاب الٹ دی اور بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ اپنے دیوان خانے کے زینے ہی

میں اس نے زندگی میں پہلی بار ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بوا سبز قدم۔"

"حوصلہ رکھئے میرزا صاحب اوپر چلئے .... آپ تو مغل بچے ہیں۔"

اور جیسے کسی نے اسے تھام لیا۔

"آپ راز، راز رکھنے کی کوشش میں سدھار گئے۔ وہ راز کو راز رکھنے کے لئے مر گئیں۔ آپ بھی مجبور تھے۔ وہ بھی مجبور تھیں۔ دنوں کے چڑھتے ہی میں نے پوری دلی متھ ڈالی۔ دوائیں لاتی، کوٹتی پیستی، چھانتی بناتی اور پلا دیتی۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ بگڑ کر بنتی نظر آرہی تھی لیکن تقدیر کا لکھا معلوم نہیں کیا ہو گیا کہ بیٹھے بیٹھے چکرائیں۔ خون کی قے ہوئی اور چٹ پٹ ہو گئیں۔ میں جانوں ہیرا چاٹ لیا کیوں کہ ناک کی کیل کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب تک بہن بہنوئی پہنچیں وہ ٹھنڈی پالا ہو چکی تھیں .... خالہ جان سوئم کے دن ہی سوار ہو گئیں .... میں بھی چہلم تک کی مہمان ہوں۔ قلعے سے آتے ہی سیدھے آن دھمکتے ہیں اور گھڑی دو گھڑی بعد تسلی دے کر چلے جاتے ہیں۔ اس لئے بھی پڑی تھی کہ آپ دلی پہنچتے ہی آئیں گے۔ ان کی کچھ امانتیں بھی آپ کے حوالے کرنا تھیں۔

دن آبلے بن بن کر پھوٹتے رہے اور راتیں انگاروں پر لوٹتی رہیں۔ اب تک اس نے غم کی اڑتی پرچھائیاں دیکھی تھیں۔ اب غم اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس سامنے کھڑا تھا، اس کے شانوں پر سوار ہو چکا تھا، اس کی ہڈیوں میں اتر چکا تھا۔ نہ شطرنج نہ چوسر، نہ داستان نہ غزل، دل کسی چیز میں اٹکتے

سے مجبور تھا ہلنے سے معذور تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مرحوم نواب کا کتب خانہ اس کا مرہم ہونے لگا۔ کتابیں انگلیوں سے داغدار ہونے لگیں ۔ دن بھر ہاتھوں میں کھلی رہتیں رات بھر چھاتی پر پڑی رہتیں۔ اب دنیا کے ہر مسئلے کا اس کے پاس جواب تھا۔ ہر زخم کا ایک علاج تھا۔ غزلیں اس طرح سرانجام ہونے لگیں جیسے کوئی سرہانے کھڑا املا بول رہا ہے۔ رات کے پچھلے پہر کہ ابھی تو بستر کا منہ دیکھا ہے، اک ذرا آنکھ لگی ہے کہ کسی مطلع نے شانہ پکڑ کر اٹھا دیا اور مقطعے کی تلاش میں سورج اپنی مشعل لئے کھڑا ہے۔ اک اک لفظ کی سند کے لئے صبح کی ورق گردانی رات تک جاری ہے لیکن آسمان کو اس کے پیروں کے نیچے کی یہ زمین بھی پسند نہ آئی یعنی یوسف میرزا پاگل ہو گئے اور ایسے کہ زنجیر کر دیئے گئے اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ چھوٹی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی بستیاں بس گئیں اور وہ کھڑا دیکھتا رہا کہ خود اس کی تردامنی کتنی ہی آستینوں تک پھیلی ہوئی تھی ۔

امراؤ بیگم کے اکسانے پر وہ نواب صاحب فرخ آباد کا خط لے کر صاحب بہادر ہیڈلے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب بہادر چکن کا کرتا اور ایک بر کا سوتی سفید پائجامہ پہنے اور چکن ہی کے چار باغ کی شال ڈالے برآمد ہوئے۔ خط پڑھ کر کھڑے ہوئے، مصافحہ کیا۔ شربت اور پیچوان سے تواضع کی۔ دس ہزاری کے پروانے سے باسٹھ روپے مہینے کی خواری تک کی پوری داستان توجہ سے سنی۔ تھوڑی دیر غور کر کے بڑے طنطنے سے یقین دلایا کہ اگر وہ کسی طرح کلکتے پہنچ جائے تو سارے دلدر چٹکی بجاتے

دور ہو جائیں ۔ امراؤ بیگم یہ رام کہانی سن کر پہلے تو چپکی بیٹھی رہیں پھر تڑپ کر اٹھیں اور نواب احمد بخش خاں کے نام نامہ لکھ کر اسے پکڑایا اور ہاتھ سے کنگن اتار کر فرش پر ڈال دیئے ۔

"اتنے بڑے سفر کے لئے یہ کافی تو نہیں ہیں لیکن نکالنے کے لئے ان کے سوا اب کچھ بچا نہیں ۔"

اس نے کنگن اٹھائے تو ہاتھ کانپ گئے ۔ تھوڑی دیر بعد امراؤ خاصدان لے کر آئیں تو بڑی منتوں سے کنگن ان کی کلائیوں میں ڈال دیئے ۔ چند روز بعد اپنی پنشن کا ٹھیکرہ بھرنے کی امید میں لوہارو کے لئے اٹھا ۔ منزل پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ دلی کے ریزیڈنٹ مٹکاف صاحب بہادر بھرت پور کے فوجی انتظام میں مبتلا ہیں اور نواب کو اپنی مدد کے لئے طلب کر رہے ہیں اور نواب سوار ہونے کی تیاری کر رہے ہیں ۔ امراؤ بیگم کا خط پڑھ کر نواب نے اسے اپنے سامان سفر میں باندھ لیا اور فیروز پور میں کھول دیا ۔ پورے تین دن تک مٹکاف فیروز پور میں نواب کا مہمان رہا ۔ کلاونت اور قوال اور رنڈیاں اور بھڑوے اور منشی اور متصدی کون تھا جو صاحب بہادر کے سامنے پیش نہ ہوا لیکن مرحوم بھائی کے مظلوم داماد کو قریب نہ پھٹکنے دیا گیا ۔ وہ دلی کے اندیشوں سے کانپ رہا تھا اور کلکتہ امیدوں کا مرکز ہو چکا تھا ۔ کہ ترک بیگم کی انگوٹھی یاد آئی جو ٹوپی کے استر میں سلی تھی اور دس پانچ مہریں کمر سے بندھی تھیں ۔ وہ بستر سے اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا ۔

لکھنؤ کی سرائے پر اترا تو زخموں کے انگور بھرنے لگے تھے اور جدائی کا رنگ میلا ہو چلا تھا۔ سامان رکھتے رکھتے اندازہ ہو گیا کہ اس سے پہلے اس کا نام پہنچ چکا ہے۔ دوسرے دن کا سورج ڈوبتے ڈوبتے قدر دانوں کا تانتا بندھ گیا۔ بزرگ آتے زربفت و کمخواب و جامے وار اور نرم پرم کے خفتان اور انگرکھے اور چغے پہنے، سروں پر پتلی پتلی کشتیوں جیسی نازک ٹوپیاں رکھے، وسمے سے رنگے ہوئے پٹے، داڑھی مونچھ کا ایک ایک بال بنا ہوا، پاجامہ اُڑسی ہوا تو جلد بدن کی طرح منڈھا، کھلا ہے تو ایک ایک ٹھوکر پر دو دو گز کی خبر لیتا ہوا۔ ایسی ایسی نازک اور کامدار اور جڑاؤ آرام پائیاں کہ عورتیں پیروں کے بجائے کانوں میں پہن لیں۔ شانوں پر "چار باغ" کھلے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کے ڈھیر لگے ہوئے۔ بدن کی ہر جنبش کانٹے پر تلی ہوئی۔ منھ سے نکلا ہر لفظ کسوٹی کسا ہوا۔ بولے تو موتیوں کے ڈھیر لگا دے، ہنسے تو زعفران کے تختے کھلا دیئے۔ کڑوے بول کبھی سنے تو اس طرح جیسے شربت کے گھونٹ پی رہے ہوں۔ اٹھے تو بادب، بیٹھے تو باخبر۔

ایسے ایسے بوڑھے رئیس کہ سلطنت جن کے کاندھوں پر کھڑی ہے اور حکومت جن کے پیروں میں پڑی ہے۔ شاہ اودھ جن کا مقروض ہے۔ اس طرح پیشوائی کو حاضر جیسے دلّی سے غالب نہیں شاہجہاں آیا ہو۔ آگے آگے چلتے بھی ہیں تو اس طرح کہ قدم قدم پر سلام کر رہے ہیں سنبھل سنبھل کر بڑھ رہے ہیں کہ کہیں پشت کا سامنا نہ ہو جائے۔ خادموں کی پوری فوج

کھڑی ہے لیکن مہمان کے ہاتھ خود دھلائیں گے۔ دست پاک خود پیش کریں گے۔ کھانے ایسے کہ سبحان اللہ، قیصر و کسریٰ کو میسر آجاتے تو انگلیاں چاٹ کر مر جاتے لیکن ایسی خاکساری سے پیش کر رہے ہیں جیسے اُبلی کھچڑی اور بے بگھاری دال کھلا رہے ہوں۔ دعوتیں ہیں کہ آسمان سے برس رہی ہیں، تعظیمیں ہیں کہ زمین سے ابل رہی ہیں، موتیوں کے گچھوں کی طرح آبدار غزلیں اس طرح سنا رہے ہیں جیسے مبتدی سبق سناتے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ آنکھوں میں بٹھالیں کہ کلیجے میں چھپالیں اور نوجوان بوڑھوں کی طرح سنجیدہ ادب کے پتلے، تہذیب کے مجسمے، کسے ہوئے ڈنڈ، بنے ہوئے سینے۔ سر سے پانوں تک تصویر لیکن گردن جھکی ہوئی، آنکھ نیچی، ابرو کے اشارے پر ہاتھ باندھے حاضر۔ ہنسی کی بات ہوئی تو ہونٹوں کی لکیر لمبی ہوگئی، رنج کا ذکر ہوا تو آنکھ اور جھک گئی۔ رنڈی کے کوٹھے پر پانوں رکھا تو بہشت کا دروازہ کھل گیا۔ ایک ایک صورت کہ بہزاد و مانی کی عمر بھر کی کمائی مورت بنی کھڑی ہے مٹھی بھر کمر کے آنچل میں چھپا قندیلوں کا جوڑا اڑنے کو تیار۔ نیچے چاندی کے غلاف میں سونے کے طاؤس۔ سرمہ آنکھوں سے مشرف، غازہ رخساروں سے معتبر۔ ہاتھ پانوں سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ قدموں میں گلاب پاش خالی کر دیا، دامنوں پر عطر بہا دیا۔ خاصدان سے پان کی گلوری نکال کر پیش کی کہ سینے سے دل نکال کر رکھ دیا۔ نذر کا روپیہ ہاتھوں سے لیا، آنکھوں سے لگایا، سر پر رکھا، دوزانو بیٹھ گئیں ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

"حضور سفر میں ہیں۔ جب دہلی آؤں گی در دولت پر حاضری دوں گی۔ مجری کروں گی۔ حضور خاک کی چٹکی عطا کریں گے تو کحل جواہر سمجھ کر آنکھوں میں لگا لوں گی لیکن آج محروم رہوں گی۔"

خانم اٹھیں۔ سازندوں اور کلاونتوں کو مخاطب کر کے بولیں۔

"یہ وہ ہیں جنھوں نے لال قلعے کے اندر لال پردے کے پیچھے راجہ اندر کے اکھاڑے دیکھے ہیں۔ ان کے کان کسوٹی اور آنکھیں سند ہیں۔ ایک ایک راگ پر اشرفی، ایک ایک الاپ پر روپیہ نچھاور کروں گی لیکن خبردار ایک ہاتھ بھی جھوٹا ہوا تو عمر بھر منہ نہ دیکھوں گی۔"

خانم کے بیٹھتے ہی ساز سانس لینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لو دینے لگے۔ پھر کہیں بجلی سی چمکی اور قیامت لڑکی کا روپ بھر کر کھڑی ہو گئی اور چمک کر اسی کی غزل چھیڑ دی ؎

شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

شعر بتانے پر آتی تو خود اس کا شعر اسی کے سامنے معانی کی نئی نئی پرتیں کھولنے لگتا، رقص کرتی تو زمین ہلنے لگتی، تان لیتی تو آسمان روشن ہو جاتا۔ ساز و آواز میں وہ رن پڑ رہے تھے کہ معاذ اللہ اور خانم اسی طرح بیٹھی تھیں جیسے ان کے کوٹھے کی تقدیر لکھی جا رہی ہو۔ اٹھنے کے لئے پہلو بدلا تو پوری محفل کھڑی ہو گئی۔ خانم ہاتھ باندھ کر بولیں۔

"حضور دسترخوان پر قدم رکھ دیتے تو کنیز کا نصیبہ کھل جاتا۔"

اس نے تامل کیا تو جیسے رو دیں۔

"میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن لیکن یہ جو کھڑے ہیں اپنے بچوں سے کہیں گے کہ ہم نے خانم کے دسترخوان پر حضرت کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ تو حضور ایک لقمہ توڑ کر خانم کو تاریخ کا حصہ بنا دیجئے۔"

کھانا کھا کر نیچے اترا تو سبز گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ بری خانم نے اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا، بازدید کے وعدے لئے، جمعدار کو پیچھے کھڑا کیا اور ہاتھ باندھ لئے۔

یہ سب کچھ تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ تھا جس کے دیکھنے کی آرزو میں آنکھیں دہک رہی تھیں۔ قصر شاہی کے پھاٹک پر وہ جرّار لشکر کہاں تھا جن کے گھوڑوں کے لئے لڑائی کے میدانوں نے خون کے قالین بچھا دیئے ہوں، جن کی آبرومند تلواروں کی شجاعت و شہامت نے قسم کھائی ہو۔ کنگرہ شاہی پر وہ پرچم کہاں تھا جس کا پھریرا تاریخ ساز فتوحات پر آسمانوں سے چشمک کرتا ہے۔ توپیں گرجتیں لیکن ہیبت سلطانی سے پہاڑوں کے دل نہ دہلتے محض وقت کی تقسیم کا علم ہو جاتا۔ میدان جنگ کے شوق نے جانوروں کی لڑائی پر صبر کر لیا تھا۔ فتح کی مبارکبادیوں کی آرزو نے مرغوں اور بٹیروں کی پالیوں میں پناہ ڈھونڈھ لی تھی۔ فاتح ہاتھوں کی تپش جو گھوڑے اٹھا کر قلعوں اور شہروں کا شکار کرتی ہے کنکوے کی چرخی سے لپٹ کر سو گئی تھی۔ وراثت میں آئی شاندار تاریخ عورتوں کے شکار اور جانوروں پر فتح کے کوزوں میں بند ہو چکی تھی اور شمع دان کی شمع آدھی سے زیادہ جل چکی تھی۔ اس نے بیقرار ہو کر دیکھا مسہری کے قریب انگیٹھی کے کوئلے راکھ

ہو چکے تھے ۔ بیقراری اسے اٹھاکر باہر لے آتی ۔ سرائے کا دروازہ بند تھا۔ تمام کمرے تاریک تھے ۔ باہر پہرے دار آوازوں کے سہارے نیند کو بہلا رہے تھے ۔ وہ الوان کو سلیقے سے اوڑھ کر ٹہلنے لگا۔

"میرزا صاحب کو کچھ تکلیف ہے ۔"

سامنے بھٹیارن غلطے کے پائجامے کے دونوں پائینچے ایک ہاتھ پر ڈالے دوسرے کی چٹکیوں سے کرتی کے چاک جن سے نیفہ نظر آرہا تھا برابر کر رہی تھیں ۔ سر پر چنا ہوا کامدار دوپٹہ چمک رہا تھا۔ اس سے کم از کم پانچ سات سال بڑی عمر کی عورت بیگموں کی طرح شان سے کھڑی سوال کر رہی تھی ۔

"کوئی خاص بات نہیں سر میں ذرا درد ہے ۔"

"میں ابھی حاضر ہوئی ۔"

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ شمعدان کے پاس چونک کر کھڑی ہوگئی ۔

"کتنے بد سلیقہ اور پھوہڑ نوکر آنے لگے ہیں ۔ یہ چربی کی موم بتی کمبخت نے آپ کے کمرے میں رکھ دی ۔ میں جانوں اسی سے سر میں درد ہو گیا۔ میں کہوں کہ پورے دس دن آج ہو گئے حضرت کو آئے ہوئے ۔ کیا بات ہے آخر کہ آدھی رات کے وقت اس طرح پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔"

اس نے طاق سے دوسری شمع اٹھا کر جلا دی ۔

ہاتھ کا کنٹر کھلا تو فیض آباد کی چنبیلی کی خوشبو سے تمام کمرہ مہک اٹھا۔ تکیوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ وہ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے سر دابنے لگی اور آنکھ جھپکنے لگی ۔ داہنے تلوے میں تیل مل رہی تھی کہ وہ سو گیا ۔

صبح جب تبریدے لے کر آئی تو اس کے ساتھ شوہر بھی تھے۔ ریشم کے کرتے تہمد پر بڑے بڑے پٹوں میں تیل، آنکھوں میں سرمہ، انگلیوں میں انگوٹھیاں۔

"رات کی تکلیف کے لئے شرمندہ، معافی کا خواستگار ہوں۔ آج سے میں خود نگاہ رکھوں گا اور حضور کو کسی خدمت کی ضرورت ہوا کرے تو بلا تکلف فرما دیا کریں۔"

ان عام انسانوں کی ذاتی ہمدردی کے چھوٹے چھوٹے قطروں کو جمع کر کے اجتماعی ہمدردی کے سمندر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس کی ایک دھار سے قوم کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے لیکن کس قوم کی جو ہر سو کچاس کوس پر بدل جاتی ہے۔ نہ ایک زبان بولتی ہے، نہ ایک لباس پہنتی ہے، نہ ایک طرح کا کھانا کھاتی ہے۔ رسم و رواج الگ، تیج تیوہار الگ۔ انتہا ہے کہ عقیدے تک الگ۔ حقہ جل گیا لیکن وہ سلگتا رہا۔

رات کی زلفیں کھل رہی تھیں۔ کعبۂ ہندوستان کاشی کی معظم عمارتوں کی روشنیوں نے گنگا کے مقدس پانیوں پر چراغوں کی چادریں بچھا دی تھیں۔ وہ گھوڑے پر سوار دیر تک کھڑا رہا جیسے سلامی دے رہا ہو۔ سرائے کی سنگیں عمارت پر محل کا دھوکا ہوا۔ کمرے میں پہنچا جیسے اپنے گھر میں آ گیا ہو۔ ذرّے ذرّے سے انسیت پھوٹی پڑتی، چپے چپے سے محبت ابلی پڑتی، جیسے چاندی کی گھنٹیوں میں مصری کی ڈلیاں گھل رہی ہیں۔ صبح کسی سے کرائے کے مکان کا ذکر کیا۔ اس نے دو پہر میں آمادہ دیا۔ ایک اشرفی نکلی اور مکان جگ مگ

کرنے لگا۔ لوگ نام سے واقف نہ کام سے آشنا لیکن بچھے جارہے ہیں۔ کئی دن تک وہ کانپور اور باندہ اور الہ آباد کے سفر کی تکان آتارتا رہا۔ شام کو نہا دھو کر گنگا کی سیر کو نکلا۔ گھاٹ کو جانے والی گلیاں اتنی صاف کہ جوتیاں آتار کر چلنے کو جی چاہے۔ چمکتے ہوئے دروازوں سے جھانکتے ہوئے صحن ایسے شفاف جیسے پتھروں کے رنگوں کے فرش ابھی کھول کر بچھائے ہوں۔ پیتل کے جگمگاتے ہوئے باسن کہ زرگروں نے اپنے خزانے نکال کر ڈال دیئے ہیں۔ گھاٹ کی رونق دیکھی تو جمنا کے میلے حقیر ہو گئے۔ کشتیاں سنگھاسن کی طرح سجی ہیں، پوششیں پڑی ہیں، تکیے لگے ہیں۔ صورتیں ایسی پاکیزہ کہ رشی دیکھ لیں تو چرن چھو لیں۔ مورتیں ایسی موہنی کہ راجے مہاراجے ایک ایک جھلک پر جنم جنم کا بن باس مول لے لیں۔ حدِ نگاہ تک پانی پر میلہ لگا ہے۔ ایک شہر رواں ہے کہ دریا پر کھلا پڑا ہے۔ پان کی دوکان ایسی سجی ہوئی جیسے ڈیرے دار طوائف بادشاہ کا انتظار کر رہی ہو۔ حلوائیوں کے خوانچے سجے ہیں کہ شہنشاہوں کی نذر کے تھال لگے ہیں ہاتھ میں گھنگھرو باندھے بنگ گھونٹ رہے ہیں کہ ناچنے والیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ سستے پتھروں کی دوکانیں لگی ہیں کہ جواہر خانے پڑے دمک رہے ہیں۔ سائے لمبے ہونے لگے، چراغ جلنے لگے، چراغ بجھنے لگے لیکن وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہا۔

پھر تو جیسے دستور ہو گیا کہ صبح کے دھندلکے سے دن چڑھے تک اور دن ڈھلے سے رات گئے تک وہ پتھروں پر بیٹھا رہتا۔ بہتے پانیوں پر گذرتے

نظاروں نے وہ پاٹھ پڑھایا کہ شانوں پر چڑھے ہوئے دکھ کے پہاڑ چور چور ہوکر بکھر گئے۔ فضا کی روشن ضمیری نے وہ سبق دیئے کہ روح کے دلدّر دھل گئے۔ سارا وجود ہنس کے پر کی طرح ہلکا اور بے نیاز ہوگیا۔ ایک صبح وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کلکتے کی مہم سر ہوجائے تو یہیں کہیں ایک کٹیا بناکر باقی عمر گنگا کے کنارے گذار دے۔ ابھی وہ اس خیال کے مزے لے رہا تھا کہ کوئی پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہ مرگ چھالے پر آسن مارے براج رہے ہیں۔ ماتھے پر چندن کی لکیریں کھل رہی ہیں کانوں میں مندرے ہل رہے ہیں۔ سر پر پگیا بندھی ہے۔ گلے میں رُدراج کی مالا پڑی ہے اور وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ ماورالنہر کے بدنصیب مگر مغرور شہزادے کا ہاتھ سلام کے لئے خود بہ خود اٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکایا اور اس طرح بولے جیسے وردان دے رہے ہوں۔

"خوش رہو۔"

"کرم۔ بچار کی کوکھ سے پھوٹتا ہے اسی لئے بچاروں کو سوچ بچار کر پالنا ودوان کا کرتویہ ہے۔"

"تم یہاں شانتی کے لئے بھٹک رہے ہو اور شانتی پچھم میں جمنا تٹ پر تمھارے بروگ میں بال بکھرائے پڑی ہے۔"

"مہاراج۔"

"پرشاد لو... منھ میں رکھ لو۔"

"مہاراج ایک بات۔"

"ہم کو جو کہنا تھا وہ ہم کہہ چکے، اس سے زیادہ کا ادھیکار نہیں ہے۔"

اس نے پھر بھی کچھ کہنا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکلی کہ مہراج نے ہاتھ جوڑ لئے تھے۔ ساری رات مہاراج آنکھوں میں براجے رہے اور ان کے شبد ہتھوڑوں کی طرح کانوں پر پڑتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اپنے گھر کا سامان بیچنے کا سلسلہ کرنے لگا اور دوسرے دن کا سورج نکلتے نکلتے کلکتہ کے لئے سوار ہوگیا۔

کلکتہ پہنچ کر سمندر کو دیکھا تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ مٹھی بھر انگریز کروڑوں ہندوستانیوں کے اس براعظم پر کیوں کر چھا گئے۔ پانی زندگی کا جنم داتا، پانی آفات سماوی میں زندگی کرنے کے درس کا مدرس۔ اور وہ پانیوں کے پالے ہوئے، پانیوں پر فتح پائے ہوئے۔ پانی میں ڈوبتے ہوئے دشمن کو بچانے کی کوشش نے ان کو اجتماعی ہمدردی اور قربانی کے صحیفوں کا حافظ بنا دیا اور ہم کہ خشکی کے کیڑے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہے ہیں اور دوسروں کے گنبد و مینار دیکھ دیکھ کر اپنے سر پھوڑ رہے ہیں۔ کسی کے جلتے گھر کی آگ سے اپنے اندھیارے روشن کر رہے ہیں۔ جھیلوں اور دریاؤں سے ڈرنے والے سمندروں کو اپنی بغل میں لپیٹ لینے والوں کے سامنے ہار گئے کہ یہی ان کا مقدر تھا۔ ٹھنڈی سڑک پر جوان عورتیں ایسے کپڑے پہنے جن میں برہنہ پنڈلیوں کے دوشاخے روشن ہیں اور بازوؤں کے خنجر فروزاں ہیں، اپنے بزرگوں اور بچوں کے

ساتھ اس طرح ٹہل رہی ہیں جیسے یہ کائنات ان کی ہے ۔ اپنے مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے اٹکھیلیاں کر رہی ہیں ۔ گویا یہ زندگی اور یہ زمین انھیں کی ہے ۔ پانی میں نہا رہی ہیں ۔ نہ کھلنے کا ہوش نہ ڈھکنے کی فکر۔ اپنے اوپر اعتماد ہے کہ ہماری مرضی کے بغیر کوئی آنکھ ہمارے بدن کو میلا نہیں کر سکتی ۔ عورت ہماری شریکِ بستر ہے اور ان کی شریکِ حیات، شریکِ زندگی ۔ زندگی اور بستر میں جو فرق ہے وہ بھی ہم نہیں جانتے کہ ہماری زندگی کی بہار کا نام بہارِ بستر ہو کر رہ گیا ہے ۔ فٹنیں اور شکر میں اور بوبے سڑک پر گذر رہے ہیں ۔ گھوڑے ایسے کہ جلد پر مکھی کیا، نگاہ بیٹھ جائے تو پھسل جائے ۔ سوار ایسے کہ موت دیکھ لے تو ڈر جائے ۔ سامنے سے پیادے گذر رہے ہیں ۔ سب کے ہتھیار ایک کارخانے کے ڈھلے ہوئے ۔ سب کے لباس ایک قینچی کے کٹے ہوئے ، ایک دھوبی کے دھلے ہوئے ۔ ایک سی پگڑی، ایک سے جوتے ۔ رپ رپ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ شانوں پر نشان نہ ہوں تو منصب اور مرتبے کا پتہ نہ چلے ۔ سڑکیں ایسی کشادہ اور نہائی دھوئی پڑی ہیں کہ محلوں کے چبوترے شرمندہ ہو جائیں۔ راتیں اتنی روشن جیسے پورا شہر روشنیوں کا جشن منا رہا ہو ۔

دس کا گھنٹہ بجا اور بڑے سے بڑے دفتر کی ایک ایک جگہ پر ہو گئی۔ ایک ایک آنکھ مستعد، ایک ایک ہاتھ مصروف ۔ سیکڑوں آدمی حاضر لیکن شور نہ غل ۔ ایک قانون کی تلوار ہے کہ سب کے سروں پر لٹک رہی ہے ایک تنظیم ہے کہ سب جس کے سامنے جواب دہ ہیں ۔ پورے ملک کا وہ

کون ساصوبہ، کون سا علاقہ ہے جس کے سفیر اور وکیل اپنے معاملات اور مقدمات کے دفتر باندھے حاضر نہ ہوں۔ کلکتہ ایک شہر نہیں ایک حاکم ہے جو پورے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نظم ونثر کے نئے میزان نصب کر رہا ہے، نئے میزان وضع کر رہا ہے اور حکومت کی مشین کے پرزے ڈھال رہا ہے اور قلم بنا رہا ہے۔ ہماری پوری تاریخ تلوار پر بھروسے کی کہانی ہے، تلوار کی عبادت کی کہانی ہے قلم کی غلامی کی کہانی ہے۔ ہم کو یہ یاد رہا کہ تلوار کی کاٹ صرف جسم تک محدود ہے۔ یہ بھول گئے اور بھول کیا گئے، یہ معلوم ہی کب تھا کہ قلم کی مار نسلوں اور پشتوں تک کی حدود سے گذر جاتی ہے۔

علم کے نئے چاک سے اتری ہوئی نسل شعر و ادب اور انشا رسے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے اپنے شعر و ادب سے تو بہت دور نکل آئی ہے کہ علم کا نام صرف شعر و انشا نہیں ہے۔ مشاعروں میں ہمارے باکمالوں کے تیر و نشتر بھی اسے تڑپانے سے عاجز ہیں۔ ان کی زبانوں کی خاموشی اور آنکھوں کی نیازمندی میں بھی ہمارے لئے ایک تحقیر ہوتی جسے پشتوں کے حفظ مراتب برملا ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

اتوار کا دن کیا آیا کہ کلیسا کا در کھلا کہ بارگاہِ رب العزّت کا دروازہ کھلا۔ لارڈ سے سپاہی تک معمولی سجاؤ بناؤ مگر انکساری اور خاکساری کے ساتھ بمعہ پورے کنبے کے حاضر ہے۔ کاروبار حیات میں پورے ہفتے کی اپنی کارگذاری پیش کرنے کو موجود ہے۔ ہم اپنے مذہب سے دنیا کی بھیک

مانگتے ہیں اور وہ اپنی دنیا سے اپنے مذہب کو مقدس بناتے ہیں۔ کوئی ملحد ہے نہ کافر، نہ شیعہ نہ سنی نہ وہابی نہ بریلوی، سب اپنے اپنے چھوٹے بڑے اچھے برے اعمال و اقوال سے اپنے خدائے بزرگ کی برتری پر رضامند اور مطمئن۔ قومیں جب عروج کے راستے پر پڑتی ہیں تو ان کی جیسی ہو جاتی ہیں اور جب زوال کے گلیاروں پر ڈھلکتی ہیں تو ہماری جیسی ہو جاتی ہیں۔

سامنے ایک جہاز لنگر ڈال رہا تھا کہ پورا لال قلعہ پورا جہان آباد پانی پر تیر رہا تھا۔ موجوں کے اژدہے ساحل پر سر پٹک رہے تھے۔ گرانڈیل توپیں کہ پہاڑوں کے دھوئیں اڑا دیں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ دریا ان کے بوجھ سے کچلا جا رہا تھا اور کشتیوں کے قافلے اپنے چپوؤں کے بازو ہلاتے سیاہ عقابوں کی ڈار کے مانند اس کی طرف اڑ رہے تھے اور کوئی ہلچل نہ تھی۔ کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ سب کچھ اتنی آسانی اور خاموشی سے ہو رہا تھا جیسے قلعے میں ہاتھیوں سے خزانہ اتر رہا ہو اور جیسے یہ سب کچھ روز کا معمول ہو۔

پھر اس نے پنشن کا ٹھیکرہ مقدمے کے کاغذوں میں لپیٹا اور کشتی پر سوار ہو گیا اور ایک بھٹکے ہوئے کبوتر کی طرح دلّی کی چھتری پر اتر پڑا اور بلیوں سے چھپتا اپنے کابک میں داخل ہو گیا۔ امراؤ بیگم نے اپنے پیروں کی چاندی بیچ کر باورچی خانہ روشن اور دیوان خانہ آباد کر دیا۔

ویرانے اس کے دنوں سے ویرانی کا قرض مانگتے رہے۔ راتیں اس کے گھر کی سیاہی سے بھیک مانگتی رہیں۔ لیکن قلم سے فگار انگلیوں کی روشنی

میں تیسری آنکھ مضامین ڈھونڈتی رہی۔ سینے کے چاک روشنائی سے بھرتے رہے اور دیوان روز و شب کے ورق الٹتے رہے۔

پھر ایک جگنو چمکا۔ میرزا نظر سلطان کے چوبدار نے ایک رقعہ اور ان کے مشاعرے میں شرکت کا حکم نامہ پیش کیا۔ قلعۂ معلّٰی کی چوبیں مسجد کے سامنے آبنوس کے منقش ستونوں پر شجر شامیانہ بلند تھا۔ تین طرف گجراتی مخمل کی سرخ دیواریں کھڑی تھیں۔ کوری چاندنی کے فرش پر کشمیری اور ولایتی قالینوں کا دوہرا فرش تھا۔ طلا کار مخمل اور زربفت کی مسندیں پڑی تھیں۔ نگاہ پڑتے ہی میرزا نے پیشوائی کی۔ نقرئی تخت کے داہنی طرف بٹھا کر اپنے ہاتھ سے تکیہ لگا دیا۔ تخت کی پشت پر کلابتو کے موتیوں کی جلمنیں پڑی تھیں اور فانوسوں، جھاڑوں، کنولوں اور گلاسوں کی روشنی میں مالائے مروارید کی چادروں کو لجلا رہی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چاندی کے پیک دان رکھے تھے۔ قدم قدم عود دانوں سے خوشبوؤں کے چھلّے اٹھ رہے تھے اور خدام دامنوں پر عطر مل رہے تھے اور تخت سے ذرا فاصلے پر دور تک مجمع بیٹھا ہوا تھا لیکن اس طرح خاموش جیسے شہنشاہ کے سامنے کھڑا ہو کہ مومن خاں مومنؔ آگیا۔ نکلتا قد، چھریرا بدن سبزہ رنگ ٹانگوں میں سبز گلبدن کا عرض کا پاجامہ، بر میں جامے وار کا خفتان، شانوں پر اسی وضع کا دوشالہ، بڑے بڑے سیاہ گھونگھر والے بال شانوں پر اڑتے ہوئے، غلافی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا۔ انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں تڑپتی ہوئی۔ ہنستا تو دانتوں کی مِسّی جھلک جاتی۔ دیکھتے ہی سب کو چھوڑ کر آیا اور بغل گیر

ہوگیا۔ ہاتھ میں ہاتھ لے کر پہلو میں بیٹھ گیا اور سفرِ کلکتہ کا ذکر کر کے زلفِ بنگال کے پیچ وخم کھولنے لگا۔ پھر ذوق آگئے۔ اپنی شاعری کی طرح پستہ قد، سب کچھ پاکر بھی حسد کی آگ سے تپا ہوا کالا رنگ۔ پورا چہرہ چیچک سے چھدا ہوا۔ مخمل کا قلمکار فرغل جس کی آستینوں پر گھنا کام جیسے سارے محاورے ٹانک لئے ہوں۔ چھوٹی مہری کا پاجامہ روز مرے کی طرح عام، کمر میں دوشالہ، سر پر قالب سے اتری گول ٹوپی، چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی محتاط نظریں۔ تخت کے بائیں طرف مسند سے لگا کر بٹھا دیئے گئے۔ پھر مفتی صدرالدین آزردہ آگئے۔ ثقاہت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے شعور فن کے کانٹے میں تلے ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں آئے تو جیسے ریاست اور وجاہت آگئی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ساتھ اس کے پاس ہی بیٹھ گئے کہ نقیب کڑکا۔

"گوش بر آواز... نگاہ روبرو.... ادب لازم .... میرزا سراج الدین محمد ظفر صاحب عالم۔"

ظفر نے مجمعے کو ملاحظہ کیا اور تخت پر مسند سے لگ کر بیٹھ گئے۔ نواب شمس الدین والئ فیروز پور اور نواب جھجر تخت کے دونوں پایوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ میرزا نظر سلطان ہاتھ باندھ کر سامنے ہوئے۔

"صاحبِ عالم کا حکم ہو تو مشاعرے کا آغاز کیا جائے۔"

ظفر نے جواب میں ہاتھ کا اشارہ دیا۔

دلی کے مشہور خوش آواز امرد طوطی خاں نے غزل چھیڑ دی۔ اس کی

آواز کے سحر میں ظفر کی غزل ایسی لگی جیسے چاندی کی طشتری میں تانبے کے پیسے۔ غزلیں ہوتی رہیں۔ آدھی رات کے قریب چوبدار نے شمعدان اس کے سامنے رکھا تو موتمن نے شمعدان اٹھاکر اپنے سامنے رکھ لیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"میرزا نوشہ سے پہلے آج ہم کو پڑھنے کی اجازت عطا ہو صاحب عالم"۔ جواب کا انتظار کئے بغیر اس کی آواز کے شعلے لپکنے لگے۔ سارے مشاعرے کی غزلیں خس و خاشاک ہو کر رہ گئیں۔ کیا تلاش مضمون اور کیا قدرتِ بیان اور کیا ادائگی فکر اور آواز کا ایک سحر تھا کہ طاری تھا معلوم ہوتا تھا سونے کے تھال میں موتیوں کے ڈھیر لگادیئے ہیں۔ ظفر نے داد دی لیکن جیسے بندھا ہوا حصہ دیا جاتا ہے۔ پھر کہیں دور سے اپنی ہی آواز آئی۔ اور جب یہ شعر پڑھا ؎

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

تو جیسے چلمنوں کے پیچھے "واہ" میں لپٹی آہ نکل گئی۔ موتمن، شیفتہ، آزردہ اور فضل حق کے علاوہ سب خاموش تھے۔ رہے عوام الناس تو ان کی واہ کیا اور آہ کیا۔ ظفر نے ذوق کی سنت میں ایک عدد واہ کی تکلیف گوارہ کر لی۔ مجمع قلعے کا تھا۔ جو لوگ شہر کے بھی تھے وہ قلعے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قلعے کی پسند اور ناپسند سے واقف تھے۔ دنیا حق بھی اسی کو دیتی ہے جو اس کے حلق سے اپنا حق نکال لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ ذوق کی غزل پر

کہرام مچ گیا کہ قلعے کے استاد تھے اور ظفر کا منہ ذوق کو داد دے رہا تھا۔ نہیں داد کی بارش کر رہا تھا۔ سننے والوں کے ذوق کی پستی اس کو داد دے رہی تھی۔ مشاعرہ ختم ہو گیا۔ میرزا نظر سلطان اپنے معزز مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے اور وہ ایک کونے میں کھڑا ان کی فرصت کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ مخاطب ہوں تو رخصت کے ساتھ سواری بھی طلب کرے، کہ چغتائی بیگم کا ملازم خاص سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

"بیگم حضرت کی گاڑی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

"کیا نواب صاحب فرخ آباد تشریف لائے ہیں؟"

"غلام کو اس کا علم نہیں۔"

وہ دالان میں تھا کہ دروازے کی چلمن ہٹا کر چغتائی بیگم سامنے آگئیں اور پیشوائی کرتی کمرے میں لے گئیں۔ مسند کے سامنے لگن میں انگیٹھی رکھی تھی، انگارے دہک رہے تھے۔ اس کے بیٹھتے ہی ایک کنیز نے جاڑے کی راتوں کو دولھن بنا دینے کا سامان چن دیا۔ بوتل اس نے کھولی اور پیالے میں گلاب چغتائی بیگم نے ڈھالا۔ گوشت کے ساتھ ایک پیالہ پیٹ میں پہنچا تو رگوں میں آگ دوڑنے لگی۔ دوشالہ کاندھوں سے گر گیا۔ حافظے میں چراغ جلنے لگے۔

"آج مشاعرے میں آپ نے جو مرثیہ پڑھا۔"

"مرثیہ؟"

"اچھا خیر... غزل سہی.... ایک بار عطا کر دیجئے۔"

وہ چسکیاں لیتا رہا مصرعے چھیڑتا رہا۔ کچھ اشعار ہوئے تھے کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں سے ترک بیگم آگئی ہیں۔ تربوزی اطلس کی پشواز پر اکہرے گھنگھرو باندھے پہلو سے لگی بیٹھی ہیں اور اس کے بازو پر آگ کی لپٹوں کے ڈھیر پڑے ہیں اور وہ غزل سنا رہا ہے۔ اپنی سرمست آواز سے مصرعوں کے خنجروں پر دھار رکھ رہا ہے۔ غزل ختم ہوئی تو چغتائی بیگم کہیں دور سے بولیں۔

"کیا خوش نصیب عورت تھی۔"

"کیا شاندار عورت تھی۔"

"کون؟"

اس نے سر سے پانوں تک دھڑک کر پوچھا۔

"وہی جو قربان گاہِ محبت پر قربان ہوگئی جس نے آپ کی شاعری کو سوز کا خلعت پہنا دیا اور آواز پر درد کی دھار رکھ دی.... آپ کو میرے سر کی قسم میرزا صاحب اس قتالۂ عالم کا نام بتا دیجئے۔"

اب وہ متھرا کی بارہ دری میں سجی ترک بیگم کی سیج سے اٹھ کر چغتائی بیگم کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ عمر نے چغتائی بیگم کا روپ نکھار دیا تھا جیسے مہتاب باغ کا خاص الخاص پیوندی آم پال سے اٹھ آیا ہو۔ خم اور گہرے ابھار اور اونچے زاویئے اور قاتل ہو چکے تھے۔ وہ میوے سے لدی شاخ کی طرح اس پر جھکی ہوئی تھیں۔

"وہ ایک ڈومنی تھی چغتائی بیگم۔"

"ڈومنی ...؟"

"ہاں چغتائی بیگم محض اک ڈومنی۔"

"کیا نام تھا اس ڈومنی کا میرزا صاحب۔"

"ڈومنیوں کے بھی کہیں نام ہوتے ہیں ... ہر رات ایک نیا نام تجویز کرکے سحر ہو جاتی ہے۔"

اس نے دوسرا پیالہ خالی کر کے طشت پر رکھ دیا۔

"آپ کی راتوں نے بھی تو اس کا کوئی نام رکھا ہوگا۔"

"ہماری محرومیوں نے زندگی کرنے کے لئے اس کا نام چغتائی بیگم رکھ لیا تھا۔"

"کیا فرما رہے ہیں آپ میرزا صاحب۔"

"ہم بھی چغتائی بیگم دنیا کی طرح جھوٹ ہی بولنا چاہتے تھے لیکن اس کمبخت شراب نے بولنے نہ دیا۔ یہ کہاں معلوم تھا کہ زندگی میں کبھی ایک رات ایسی بھی آئے گی کہ ہم چغتائی بیگم کے شبستاں میں تنہا ان کے پہلو میں بیٹھے ہوں گے اور ہمارے پیالوں میں آفتاب و ماہتاب اتر رہے ہوں گے۔"

"لیکن آپ نے کبھی اظہار۔"

"اظہار نہیں کیا۔ اظہار بھی کرتے تو کس منہ سے کرتے۔ قلعۂ معلیٰ کا ولی عہد اور ریاستوں کے والی جس کی راتوں کو ترستے ہوں اس کی چاہت کا سودا کان پر رکھا ہوا ایک معتوب اور مردود قلم کیسے کر سکتا تھا۔"

"چغتائی بیگم کو آپ نے بڑے سستے داموں بیچ دیا میرزا صاحب"
اس نے جھرجھری لے کر اپنے پیروں پر لرزتے ہاتھ تھام لئے۔
"ہم نے تو آپ کے تکبّر اور تبختر کی کہانیاں سنی تھیں۔ آپ تو انکساری اور خاکساری کی حدوں سے بھی نکل گئے۔ آپ کبھی ہمارے دروازے پر دستک دے کر تو دیکھئے"
"دستک... دستک ہی دینا تو ہم نہیں جانتے
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائیے"
"تو آپ نے کسی مشاطہ کے ذریعے اپنے گذرنے کا وقت بتا دیا ہوتا تو ہم دروازے پر کھڑے تصویر ہو جاتے"
"عجیب بات ہے چغتائی بیگم۔ شراب ہم پی رہے ہیں اور نشہ آپ کو آ رہا ہے"
اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چغتائی بیگم کو توڑ لیا... ایک اکیلی شراب کی بیچاری خوشبو ان کی تیز خوشبوؤں کے نیچے کچل کر رہ گئی۔ دامن پر گلستان کے گلستاں کھل گئے۔ باہوں میں کہکشاں کی کہکشاں چرمرا کر رہ گئی۔ صبح کا گجر بجا تو وہ ہنس دیا کہ گجر بجانے والے نے بھی آج چڑھا رکھی ہے۔ اس نے چغتائی بیگم کی معنبر زلفوں کو ہٹا کر دیکھا تو چمن کے درختوں کی پھنگیوں پر دھوپ ان کی شبنم سکھا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر خواب گاہ کا جائزہ لیا۔ کچی چاندی کے نقشین ٹھوس پایوں اور پٹیوں کا پلنگ ریشم کے کسنوں سے کسا ہوا تخت بنا ہوا، سرہانے پرندوں کے پروں کے تکیوں میں

سر دھنسا ہوا۔ دور تک ڈھیروں بال بکھرے ہوئے، جسم پر کاشانی مخمل کی دوہری رضائی ڈالے سو رہی ہیں مسہری کے پردے بندھے ہوئے۔ اس کے ایک گوشے پر پیشواز ٹنگی ہوئی پلنگ کے نیچے اد تحہ پڑا ہوا دروازوں اور کھڑکیوں پر قلمکار ریشم کے پردے کھلے ہوئے آئینہ بند دیواروں پر نگاریں حاشیوں میں قدآدم آئینے لگے ہوئے۔ سرخ چھت گیری کے نیچے فانوس کی کہکشاں سی جگمگاتی ہوئی۔ گنگا جمنی تحفہ حلقوں میں مرصع رقم طغرے لٹکتے ہوئے۔ پلنگ کے برابر کمر تک اونچے سیمیں شمع دان میں خوشبودار شمع جلتی ہوئی۔ اس نے ہاتھ مار کر بڑھا دی۔ سامنے گرانڈیل آئینے میں وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اس نے گردن گھمائی۔ کچی نیند سے جاگی ہوئی آنکھوں میں مستی سی گھلی ہوئی۔ بھاری بھاری پپوٹوں کے نیچے لانبی لانبی پلکوں کے درمیان لال لال ڈورے جھانکتے ہوئے۔ رضائی شانوں سے ڈھلکی تو آنکھ جھپک گئی۔ انھوں نے شرما کر سوزنی کے نیچے سے دوشالہ کھینچ کر اوڑھ لیا۔ شمعدان کے دوسری طرف کھڑے ہوئے گھنٹے پر موگری مار دی۔ دروازے نے سانس لی پردہ ہلا اور ایک کنیز تسلیم کرنے لگی۔

"میرزا صاحب کے لئے حمام تیار کرو۔"

"تیار ہے۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اسی طرح مودب کھڑی تھی۔

"توشے خانے کی داروغہ کو بھیج دو۔"

ایک بھاری بھرکم عورت نیچے کرتے اور شلوار پر مخمل کی نیم آستین اور سونے کے کڑے پہنے آئی اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی ۔ وہ طاق میں رکھے ہوئے عاج کے قلمدان کو دیکھ رہا تھا ۔ عورت چلی گئی ۔ وہ ایک کنیز کے ساتھ حمام میں داخل ہوا ۔ دیو پیکر آئینے کی شاخ میں ریشم کا کرتا اور گلبدن کا پائجامہ ٹنگا ہوا تھا ۔ پا انداز کے پاس چاندی کی کھڑاویں رکھی تھیں ۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کے تمام برتن چاندی کے تھے ۔ ایک کونے میں بڑی سی انگیٹھی دہک رہی تھی ۔ ایک طاق میں ابٹن اور کھلی اور بیسن کے نقرئی برتن بند رکھے تھے ۔ دوسرے طاق میں سر میں لگانے کے تیل کے چھوٹے چھوٹے کنٹر سجے تھے ۔ تیسرا طاق عطر خانہ بنا ہوا تھا ۔ گرم پانی کے برتن کا ڈھکن ہٹا تو گلاب کی خوشبو سے حواس تک معطر ہو گئے ۔

نہا کر نکلا تو صدر دالان کے وسط میں زرد چمڑے کا دسترخوان لگا تھا جو رنگ رنگ کی قابوں اور قسم قسم کے کھانوں اور پھلوں سے لدا ہوا تھا ۔ اس کے ہاتھ کھینچتے ہی ایک کنیز سیلانچی اور دوسری آفتابہ لے کر حاضر ہوگئی ۔ تیسری نے بینی پاک پیش کیا ۔ کنارے کے در سے ایک عورت بھنڈا اٹھائے ہوئے ، دوسری چولڑھ تھامے ہوئے آئی ۔ بیگم نے مہنال دانتوں میں دبا کر ہلکے ہلکے دو چار کش لئے تو اناس کے خمیرے سے در و دیوار مہک گئے ۔ پھر مہنال اپنے گال سے صاف کی اور دستگی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ۔ چنگیر سے پان اٹھا کر پیش کیا ۔ منہ میں رکھتے ہی ارشاد ہوا ۔

"آپ کے محل میں اطلاع ہو چکی کہ نواب صاحب فرخ آباد نے آپ کو

روک لیا ہے۔"

"آپ کے انتظام اور سلیقے سے یہی توقع تھی۔ خانم جی کہاں ہیں نظر نہیں آئیں۔"

"لال حویلی گئی ہیں۔ ولی عہد کے بیٹے کی بسم اللہ کی تقریب میں۔ میں تو جان چھڑا کر چلی آئی۔ وہ ٹھہری ہوئی ہیں۔"

دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی کنیز نے پچیسی بچھا دی۔ ہاتھی دانت کی مرصع گوٹیں سامنے رکھ دیں۔ چغتائی بیگم نے کوڑیاں اسے پکڑا دیں۔ وہ دونوں کھیلتے رہے۔ پھر بیگم کی پلکیں جھپکنے لگیں لیکن کھیلتی رہیں۔ کھانا وقت سے پہلے لگا دیا گیا اور چغتائی بیگم اپنی خواب گاہ میں سونے چلی گئیں۔ وہ اٹھ کر کتب خانے میں آگیا۔ اخروٹ کی لکڑی کی کامدار الماریوں میں فارسی کے مشہور شاعروں کے دیوان اور قصص اور اردو کی داستانوں کے جزو چمڑے کی جلدوں اور سونے کے حرفوں سے بجے سلیقے سے آراستہ تھے۔ قلب میں سنگ مرمر کے تخت پر شیر کی کھال پڑی تھی۔ ایک طرف چاندی کا قلمدان اور ہاتھی دانت کا صندوقچہ رکھا تھا۔ وہ نیم دراز ہو کر ایک دیوان دیکھنے لگا۔ کنیز مشک کی مرصع دستگی اس کے ہاتھوں میں پکڑا کر چلی گئی۔ وہ بیدل کو پڑھتا رہا معلوم نہیں کب سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی دروازے کا پردہ مودب ہاتھوں میں سمٹ گیا۔ خواب گاہ میں چاندی کے آئینے کے سامنے سونے کی مورت کھڑی تھی۔ دونوں خواصیں جو انھیں سجا رہی تھیں سجا کر پردہ برابر کرتی باہر

چلی گئیں۔ آئینے کے دونوں طرف دو شمعیں جل رہی تھیں جیسے شیشے کی بیٹھک پر موم کے ستون کھڑے ہوں۔ وہ انھیں دیکھ رہا تھا دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور وہ اپنے زیوروں کے زاویئے برابر کرتی رہیں۔

"کون آنے والا ہے ؟"

اس نے اپنی بیقراری اگل دی۔

"آنے والا نہیں آچکا ہے"

اس نے آئینے سے نگاہ ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ساتھ ہی ایک آواز نے پردے کے پاس سے اطلاع دی۔

"خانم جی آگئیں"

پھر خانم سلطان آگئیں۔ ایک کنیز ان کے پاجامے کے پائنچے اٹھائے ساتھ ساتھ تھی۔

"میرزا صاحب.... زہے نصیب زہے نصیب آپ تو عید کے چاند سے بھی بڑھ کر ہو گئے کہ سال بہ سال منھ تو دکھا جاتا ہے۔ آپ تو برسوں جھلک نہیں دکھاتے"

"ہم شہر میں تھے کہاں ؟"

"جی ہاں سنا تھا آپ کلکتہ فتح کرنے گئے ہیں۔ خدا مبارک کرے۔ اے بی بی جلدی کیجئے۔ نواب دیوان خانے میں بیٹھے سوکھ رہے ہیں"

"کون نواب ؟"

"فخر الدولہ نواب شمس الدین خاں بہادر والیٔ ریاست فیروزی (فیروزپور

جھڑک)"۔

تو یہ تھے جو آچکے تھے۔ ان کے لیے لعل و جواہر کی دوکان سج رہی تھی۔

"آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ پہلے پوچھ لیا کیجیے تب کسی کو دعوت دیا کیجیے۔"

"اے نوج ... مجھ دعوت دینے والی پر خدا کی مار .... میں غریب سلاطینوں کی ڈیوڑھی کے سامنے اپنے چوپہلے پر سوار ہونے کو نکلی کہ نواب نے جھپٹ لیا۔ آناً فاناً گاڑی میں ڈال لیا میں نا فہم سمجھی کہ آپ کا اشارہ کنایہ ہوگا۔"

"آج میرا جی کچھ ماندہ سا ہے۔"

"اے میں قربان اس پر یہ سولہ سنگھار اور بتیس ابرن۔"

خانم نے آہستہ سے کہا لیکن اس نے سن لیا۔ خانم کی کنکھیاں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

"آج کوئی صورت نکال کر ٹال دیجیے۔"

آئینے میں دونوں کی نگاہیں ٹکرا گئیں۔ جیسے دو برچھیاں تڑپ گئی ہوں۔ پھر خانم نے اپنی برچھی ہٹالی جیسے لفظوں کو تول رہی ہوں۔ لہجے کو پرکھ رہی ہوں۔

"تھوڑی دیر کو آجائیے ... ایک غزل بتا دیجیے ... بس۔"

"ان کو آپ جانتی ہیں جب آجاتے ہیں تو ٹالے نہیں ٹلتے۔"

"خاکم بدہن نواب نہ ہوئے عزرائیل ہو گئے۔ خیر دیکھتی ہوں۔" اور

چھلاوے کی طرح نکل گئیں۔
"چغتائی بیگم ہمارے لئے اتنے بڑے بڑے خطرے کیوں مول لے رہی ہو؟"
اس نے چغتائی بیگم کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
"میں سلطان خانم کی نوچی نہیں ہوں.... سلطان خانم میری انا ہیں۔ اور نواب لال قلعے کی کہکشاں کے ایک ستارے ہیں محض ایک ستارے۔"
"اچھا... فینس لگواؤ.... اب ہمارے سوار ہونے کا وقت آگیا۔"
"لیکن اس طرح آپ فینس پر اکیلے سوار نہیں ہوں گے۔"
"چغتائی بیگم۔"
"چغتائی بیگم رنڈی نہیں ہے۔ رنڈی کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک غریب لیکن کھرے مغل کی اولاد ہے۔ انصاف ہوا ہوتا تو میرے باپ کی موت ایک بادشاہ کی موت ہوئی ہوتی۔"
"ٹھہر جاؤ۔"
اس نے دروازے کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔ جو جہاں تھا وہیں تھم گیا۔
"قتلق جان کا نام سنا ہے آپ نے؟"
"دلّی میں کس نے نہیں سنا۔"
"وہ میری ماں تھیں۔"
"بیگم۔"
"دروازے پر کھڑی خانم نے گڑگڑا کر آواز دی۔"

"وہیں سے فرما دیجئے۔"

"وہ بچھر رہے ہیں۔ گھڑی بھر کو آجائیے۔ میرے سفید چونڈے میں سیاہی نہ لگوائیے۔"

"اچھا تو صدر دالان میں دوہری مسند لگائیے اور ڈیوڑھی پر پہرہ کھڑا کر دیجئے۔ اور اطلاع دیجئے۔"

"میری ماں نے میرے باپ سے اپنے نکاح کو شہرت نہ دی کہ دنیا کہے گی مغل شہزادے نے دولت کے لئے ایک رنڈی سے بیاہ رچالیا۔ مغل کی منکوحہ فلاں کی گود میں بیٹھی تھی۔ مغل کا باورچی خانہ رنڈی کے گھنگھروؤں پر روشن ہے۔ بس اتنا کیا کہ قتلق جان کے محل کا دروازہ بند کر دیا۔"

"مشہور ہوا تھا کہ نظام نے حیدر آباد طلب کر لیا اور چلی گئیں۔"

"یہی مشہور کرایا تھا۔ لیکن برہان پور کی منزل میں تھیں۔ جب امید کے آثار نمودار ہوئے اور باپ نے وہیں خیمے ڈال دیئے۔ میں بدنصیب پیدا ہوئی۔ چند روز بعد ہی طاعون میں وہ عرش آرام گاہ ہو گئے۔ کالی مسجد میں سلا دیئے گئے۔ ماں نے عدت کے دن وہیں گذارے۔ واپسی پر خانِ دوراں کی حویلی کے پاس زرد کوٹھی خریدی۔ قبالہ سلطان خانم کے نام لکھا گیا اور اتر پڑیں۔ باقی زندگی گمنامی میں تیر دی۔ مرتے وقت کہنے لگیں کہ اگر قلعے والوں کو ہوا بھی لگ جاتی تو میرے ساتھ تجھے بھی کھینچ لے جاتے۔ سارا جمع جتھا پہ لگا کر اڑ جاتا اور ہم دانے دانے کو محتاج ہو جاتے اور

قرآن پاک کے جزدان میں کا غذات لپیٹ کر میرا ہاتھ سلطان خانم کے ہاتھ میں دے دیا۔"

"ہر شخص اپنی اپنی صلیب کے نیچے کچلا پڑا ہے۔" اور اس کے حفتان کا گریبان ہونٹوں سے دہکنے لگا۔

"صدر دالان انتظار کر رہا ہے بیگم۔"

بیگم نے سر اٹھا کر آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں بند کیں تو ان کے گوشوں پر ننھے ننھے موتی رکھے تھے۔ اس نے ہونٹ بڑھا کر توڑ لئے۔

"ہم کو رے جانے سے پہلے پھر ایک بار سوچ لیجئے۔"

"کتنے برس ہو گئے سوچتے سوچتے کہاں تک یہ مشقت لیجئے گا۔"

نواب مسند پر والیٔ ریاست کی طرح بیٹھا تھا۔ داہنے ہاتھ پر مرصع قبضے کی تلوار دھری تھی۔ شانے پر شک کی دستی پڑی تھی۔ سامنے پانوں کا چنگیر توجہ کے انتظار میں پڑا سوکھ رہا تھا۔ بیگم کو دیکھ کر سیدھا ہوا تو پٹکے کا خنجر چمک گیا۔ بیگم کی تسلیم پر مصرعہ پڑھا ؎

"آپ آئے کہ قیامت آئی"

اس پر نگاہ پڑی تو نواب کے چہرے کی شوخی بجھ گئی جیسے شراب کے ساغر میں جھینگر دیکھ لیا ہو۔

"آیئے میرزا صاحب ... تشریف رکھئے۔"

وہ نواب کے سامنے دوسری مسند پر دوزانو ہو گیا۔ بیگم دیوار کے نیچے استنبولی قالین پر بیٹھ گئیں۔

"یہ میرزا غالب ہیں نواب صاحب .... اور آپ نواب صاحب والیٔ ریاست فیروز پور "

دونوں نے مسند سے ذرا سا ابھر کر ایک دوسرے کے لئے ہاتھ اٹھائے جیسے اکھاڑے میں اترے ہوئے بانک کے استاد ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔

"جانتے ہیں خوب جانتے ہیں "

نواب نے اطلاع دی۔ جیسے کمر کا خنجر کھینچ لیا ہو اور منہ پھیر لیا۔ اور سنک کی منہال دانتوں میں دبالی۔ اس نے اپنے سامنے کی چنگیر سے پان اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور کنیز کے ہاتھ سے پیچوان کی دستگی لے لی۔ نواب کے دانت منہال کو کاٹے ڈال رہے تھے اور وہ پان چبائے جارہا تھا کہ سازندوں کے جلو میں خانم آگئیں۔ سازندے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ خانم نے چنگیر اٹھا کر نواب کو پیش کیا۔ نواب نے ایک توڑہ نکال کر خانم کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ خانم نے جھک کر سلام کیا۔ سیدھی ہو کر تالی بجائی۔ جوانی کے درخت سے ٹوٹی ہوئی ہری بھری، پھل پھول سے لدی پھندی شاخ سی لڑکی وسط میں سلام کر کے گھنگھرو چھیڑنے لگی تھی کہ نواب گرجے۔

"خانم جی ہم چغتائی بیگم کو سننے آئے ہیں دیکھنے آئے ہیں۔ اس لڑکی کو تو محل میں اٹھوا لیتے "

"بیگم کا جی ماندہ ہے۔ صبح سے چھپر کھٹ پر پڑی تھیں۔ آپ کو سلام کرنے اٹھ کر آگئیں "

نواب نے تیوری پر بل ڈال لیے اور آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگے۔
"کسی کو حکم دیجیئے کہ ہمارے آدمیوں سے ہماری چھاگل لے آئے"۔
اور تکیے سے لگ کر مہنال دانتوں میں پھر جکڑ لی۔
"داروغہ کو حکم دو کہ لال پانی کی کشتی حاضر کرے"۔
خانم نے سیڑھیوں پر کھڑے خادم کو حکم دیا۔ نواب کے منہ سے دھواں ابل رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔
دو کنیزیں دو خوان لے کر حاضر ہوئیں۔ خانم نے نواب کے آگے گزک کی قابیں رکھ دیں۔ گلاب اور شراب کے شیشے چن دیئے۔ چغتائی بیگم قالین سے اٹھیں اور دوسری لڑکی کا خوان اس کے سامنے بچھے چمڑے پر خالی کر دیا۔ نواب نے گلاب کا شیشہ ہٹا دیا اور شراب سے پیالہ بھر لیا۔ خانم نے ان کے قریب بیٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔
"رقص و سرود کی محفل تو روز ہی ہوتی ہے۔ آج آپ کی زبان مبارک سے ایک غزل عطا ہو جائے تو بندی اپنے نصیب پر ناز کرے۔
نواب نے پیالہ رکھ کر تمکنت سے گردن گھمائی۔
"ہم شاعر نہیں ہیں۔ شاعری کو کبھی کبھی اپنی مصاحبت کی اجازت ضرور دی ہے۔ آپ کے سامنے ایک پیشہ ور شاعر موجود ہے۔ اس سے فرمائش کیجیے"۔
"پیشہ ور"
اس کے منہ سے نکل گیا۔ نواب نے سن کر تبسم کیا۔ گویا آستین میں چھپا

خنجر چمک گیا۔

"آپ کے آقائے ولی نعمت حضرت سراج الدین محمد ظفر جو شاعری کی مصاحبت میں دن رات صرف کرتے ہیں کیا پیشہ ور شاعر ہیں ؟"

"صاحب عالم کا نام آپ نے کیوں کر لے لیا... وہ خدانخواستہ کسی کا قصیدہ لکھ کر روٹی کمانے کی آرزو نہیں کرتے۔ آپ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کامیاب نہیں ہو پاتے۔"

"روٹی کمانے کی ضرورت میں تو تلوار بھی مبتلا ہوئی ہے نواب صاحب۔ قلعۂ مبارک نے روٹی دینے میں تنگی کی تو تلوار مرہٹوں کی چاکری کرنے لگی۔ مرہٹوں کا وقت بگڑا تو انگریزوں کے جوتوں کی حفاظت کرنے لگی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے بڑی بڑی پاکدامن تلواروں کو اپنا خصم بدلتے دیکھا ہے۔"

"نواب زخمی سانپ کی طرح بل کھانے لگے۔ خانم بیچ میں آگئیں۔"

"عجیب بات ہے۔ آپ دونوں تلوار اور قلم پر بحث فرما رہے ہیں۔ حالانکہ دونوں کے پاس تلوار بھی ہے اور قلم بھی۔"

"اور کیا دونوں صاحب سیف و قلم ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کی تلوار بڑی ہے قلم چھوٹا اور کسی کا قلم بڑا ہے اور تلوار چھوٹی۔"

چغتائی بیگم نے پانی ڈالا۔

"میرزا صاحب آپ اپنی وہ غزل سنائیے جو آپ نے کل مشاعرے میں پڑھی تھی۔"

"ضرور سنائیے میرزا نوشہ.... قند مکرر بھی بہر حال قند ہی ہوتی ہے۔"

نواب نے ظاہری خوش دلی سے کہا اور تیسرا پیالہ ڈھال لیا۔

غزل ختم ہوئی، تعریف بھی ختم ہوئی تب نواب نے ایک ایک لفظ جما جما کر کہا۔

"میرزا نوشہ یہ غزل نہیں ہے، مرثیہ ہے اور آپ کے بجائے مرنے والی کی ماں کی زبان سے ادا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ غزل تو استاد ذوق کہتے ہیں کہ شعر کا پہلا مصرعہ ادا کر کے دوسرا چھیڑا اور سننے والے نے آدھا مصرعہ خود سنا دیا کیا بولتا ہوا قافیہ ہوتا ہے کیا پھڑکتی ہوئی ردیف ہوتی ہے۔ اچھا چغتائی بیگم رخصت۔"

دوسرا تورہ مسند پر پھینک کر کھڑے ہو گئے۔

"آپ تو قہر ڈھا رہے ہیں نواب صاحب نہ تمہید نہ دیباچہ اور کھڑے ہو گئے۔"

چغتائی بیگم نے زبان سے تو یہ کہا اور کھڑی ہو گئیں رخصت کرنے کے لئے۔ ایک کنیز نواب کے آدمیوں کو ہشیار کرنے چلی گئی۔

"اللہ نواب صاحب خاصہ تیار ہے۔ گھڑی بھر میں لگا جاتا ہے۔"

خانم نے التماس کیا۔

"نہیں خانم ہمارا کھانا تو کلاں صاحب بہادر کی کوٹھی پر ہے آج کی رات کیسی اور دن پر اٹھا رکھئے۔"

اور کنیز کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ چغتائی بیگم نے پا انداز ہی پر تسلیم کر لی۔ خانم ڈیوڑھی تک رخصت کرنے گئیں۔

"اللہ آپ دونوں تو چھری کٹاری ہوئے جا رہے تھے۔"

"نہیں آپ پر کھنچنے والی چھری کو ہم اپنی کٹار پر لے رہے تھے۔"

وہ اسے دیکھتی رہیں اور سوچتی رہیں۔

"سنئے چغتائی بیگم قصیدے میں شاعر کسی کی تعریف سے کم سروکار رکھتا ہے اس فن پر اپنی قدرت کے اظہار سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کمال کا اعلان کرتا ہے اور یہ بھی کہ جب تک شاعر غزل اور قصیدے دونوں پر دسترس نہ رکھتا ہو، بڑائی اور بزرگی سے دور رہتا ہے ۔۔۔ ہونہہ... مغل جوتوں کی خاک چاٹنے والے، مرہٹوں کے گھوڑے ٹہلانے والے اور انگریزوں کے سور چرانے والے ہمارے فنِ شریف کے منہ آتے ہیں۔"

اس نے پیالہ خالی کر کے ڈال دیا۔ چغتائی بیگم نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اجازت ہو تو دسترخوان لگواؤں۔"

"بالکل خواہش نہیں ہے ۔۔۔ دوپہر کا کھانا اسی طرح رکھا ہے۔"

"تو چلئے ذرا پائیں باغ میں ٹہلیں۔ دیکھئے چاندنی کیسی کھل رہی ہے۔"

اس نے گردن نکال کر صحن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

لال محل کا پائیں باغ سنگین چبوترے کے نیچے کھلا پڑا تھا۔ ترشی ہوئی گھاس کے تختے پر سنگ سرخ کے تالاب میں سنگ مرمر کا فوارہ چل رہا تھا۔ کھیت کرتی ہوئی چاندنی میں سارا منظر کسی مغل مصور کی دیو ہیکل تصویر کا زندہ منظر نامہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تالاب کے کنارے تپائی پر بیٹھ گئے۔ دیر تک اپنی اپنی دنیا میں کھوئے بیٹھے رہے۔

"آپ کو رقص پسند نہیں ؟"

"رقص کو ناپسند کرنے والا شاعر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ رقص موسیقی کے پیٹ سے پیدا ہوا اور موسیقی کے بطن سے شاعری نے جنم لیا ہے۔"

"تو آپ کو میرا رقص پسند نہیں۔"

"وہ کیسے ؟"

"آپ نے کل سے آج تک ایک بار بھی فرمایش کیا فرمایش کا اظہار تک نہ کیا۔"

"سچ کہتی ہو چغتائی بیگم.... لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ہم رقص کی فرمایش کر دیتے تو اپنی تنہائیوں کے یہ جشن کہاں نصیب ہوتے۔"

چغتائی بیگم کے گرد باہوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔

"ایک بات کہیں ؟"

"کیا اب بھی اجازت کی ضرورت ہے۔"

"ہم تمھارا ایسا رقص دیکھنا چاہتے ہیں جو کسی صاحب عالم اور کسی والیٔ ملک کو نصیب نہ ہوا ہو۔"

"ایسا رقص کہاں ہوتا ہے ؟"

"ہوتا ہے .... ہو گا .... لیکن ابھی تو ہمارا سر دامن بھی تمھاری قربت سے تر نہیں ہوا۔"

اس روز وہ اپنی محلسرا میں بیٹھا اپنی غریبی کا مانوس تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم اس کے پاس ہی لاش کی طرح پڑی تھیں۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر

اٹھایا۔

"کل سے صبح کی تبرید بند، شام کی شراب موقوف اور گوشت نصف یعنی صرف ایک سیر آیا کرے گا۔ دوسرے وقت سبزی اور دال۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں نہیں ممکن ہے۔ کتنے ہی گھر ہیں جہاں ہفتے میں ایک بار بھی گوشت نہیں پکتا۔ ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ہم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ہم قلندر ہیں بیگم ملے تو موتی چگ لئے نہیں تو چنے چبالئے۔ یاد رکھئے غریبی شرافت کا زیور ہوتی ہے، کلنک کا ٹیکہ نہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ صبح کی تبرید اور گوشت کے بجائے آپ ہوادار نکال دیں؟"

"نہیں تبرید اور گوشت زبان کا چٹخارہ ہے اور ہوادار آبرو۔"

وہ کچھ اور کہتیں کہ داروغہ نے نواب حامد علی خاں کی آمد کی خبر دی۔ نواب حامد علی خاں نے بیٹھتے ہی پنشن کا قصہ چھیڑ دیا اور اصرار کر کے ریزیڈنٹ دہلی فریزر صاحب بہادر کے پاس بھیج دیا۔ پھاٹک پر کھڑے انگریز سواروں کی اجازت پاکر ہوادار چھوڑا اور اردل کے ایک پیادے کے ساتھ گول کمرے میں جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد چلمن اٹھی۔ سامنے ایک لانبا چوڑا ادھیڑ عمر کا انگریز چکن کا سپید کرتا اور سپید ہی سوتی کھلا پاجامہ پہنے کھڑا تھا۔ سلام کے جواب میں مصافحے کے لئے ہاتھ پیش کیا اور کوچ پر اپنے

پاس ہی بٹھالیا۔ اس نے باپ کی موت سے اپنی موجودہ زندگی تک جو موت کا ہیولیٰ تھی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ وہ پوری توجہ اور ہمدردی سے سنتا رہا اور پیچوان سے شغل کرتا رہا۔ دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔

"کلکتہ سے مکدمہ کھارج ہونا برا ہے۔ پر کبھی اَم آپ کا معاملہ آگے بڑھائے گا اور آپ کو جسٹس ملے گا۔ اَم دیکھے گا کہ آپ کو جسٹس ملے گا۔ آپ اپنا کاگذ چھوڑ جائیے اور کمپنی پر بھروسہ رکھئے۔"

صاحب بہادر کے الفاظ اس کے کانوں پر آبِ حیات کی طرح ٹپک رہے تھے۔ شرابِ طہور کے جرعوں کی طرح عطا ہو رہے تھے۔ باہر نکلا تو موسم اور خوشگوار ہوگیا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا ایسی لگ رہی تھی جیسے شراب کے دریاؤں سے اپنے دامن بھگو کر آئی ہو۔ سورج گنبد و مینار کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ ایک اجلا اجلا اندھیارا سا چھایا جا رہا تھا اور منہ میں پانی بھرا آرہا تھا اور گھر کی ویرانی کے خیال سے حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ جی چاہا کہ وہ لال محل کی طرف پھر جائے لیکن غیرت نے پانوں پکڑ لئے۔ دیوان خانے میں قدم رکھا تھا کہ داروغہ نے ہرگوپال تفتہ کا پرچہ دیا اور تحفہ پیش کیا۔ خط پڑھتے ہی بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ کسی اہتمام کے بغیر بوتل کھولی۔ پیالہ بنایا۔ سونگھا۔ بڑا سا گھونٹ بھر کر تکیے سے پشت لگالی اور سوچنے لگا کہ دنیا کا کوئی عطر عورت کی خوشبو اور شراب کی مہک کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ جہاندار شاہ کو یہ نکتہ نہ سوجھا ورنہ ہم بھی لال کنور کا عطر لگاکر

جہاندار شاہ کو دعا دیتے اور لال پری کا عطر لگا کر چغتائی بیگم کی داد۔
"بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔"
داروغہ نے میوے سے بھری ہوئی پلیٹ لاکر سامنے رکھ دی۔ اس نے پوری پلیٹ اور آدھی بوتل حلق کے نیچے انڈیل لی اور کھانے کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ سو کر دیر سے اٹھا۔ نہا دھو کر قلمدان کھول کر بیٹھ گیا۔ ازار بند کی گرہوں کے ساتھ حافظے کی گتھیاں کھلتی جاتیں اور وہ رات کے اشعار بیاض میں لکھتا جاتا۔ مقطع کھل رہا تھا کہ داروغہ چلون پر آکر کھڑا ہو گیا۔
"ریزیڈنٹ صاحب بہادر مار ڈالے گئے۔"
"کیا!"
وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
"فریزر صاحب مار ڈالے گئے۔"
وہ دستار و خفتان سنبھالتا ہوادار پر بیٹھ گیا۔ گلیوں سے سڑکوں تک آدمیوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ سکتے کی آنکھوں کی طرح دکانوں کے پٹ کھلے تھے۔ دکاندار اور گاہک جگہ جگہ بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ پالکیاں اور نالکیاں منہ سے منہ ملائے سرگوشیاں کر رہی تھیں رتھ اور چوپہلے ایک دوسرے کے مقابل تھمے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ سوار زین سے زین ملائے کھتے سنتے چلے جا رہے تھے۔ فریزر صاحب کی کوٹھی پر ہجوم دم بدم بڑھ رہا تھا۔ انگریز افسروں کے گھوڑے ہر طرف اڑتے نظر آ رہے تھے کہ نواب فتح اللہ خاں نظر آگئے۔ وہ سلام کر کے ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی

انگریز سے کہہ رہے تھے میں نے مرحوم کو کتنا سمجھایا کہ تجھے مارنے کے لئے فیروز پور سے کریم خاں (نواب شمس الدین کا داروغۂ شکار) آیا ہوا ہے اکیلے دکیلے مت پھرا کر لیکن اس بہادر نے مان کر نہ دیا۔ وہ دیر تک کھڑا رہا پھر چلا آیا۔ پوری دلّی کی زبان پر صرف دو نام تھے۔ کریم خاں اور شمس الدین خاں، شمس الدین خاں اور کریم خاں۔

شام ہوتے ہوتے خبر آئی کہ کریم خاں پکڑا گیا.... پھر قتل میں دوسرے شریک واصل نامی نواب کے سپاہی نے نجارہ میں رپورٹ درج کرادی اور سلطانی گواہ بن گیا۔ وہ کئی دن تک گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہا کہ تقدیر نے ایک بار پھر اس کی امیدوں کے دفتر بند کر دیئے تھے۔ دھوپ کجلانے لگی تھی اور وہ دالان میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا کہ چغتائی بیگم کا پیام آ پہنچا۔ وہ داروغہ کو ہدایت دے کر نواب فرخ آباد کے بوچے پر سوار ہو گیا۔ آنکھ ملتے ہی بیگم پھٹ پڑیں۔

"تمام شہر میں شہرہ ہے کہ نواب شمس الدین کی مخبری آپ نے کی ہے خدانخواستہ .... اور نواب کی گرفتاری۔"

"کیا نواب گرفتار ہو گئے؟"

"خبر ہے تصدیق نہیں ہو سکی .... اس افواہ نے خدا کرے افواہ ہی رہے آپ کا نام بانس پر چڑھا دیا ہے۔" سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ خدا رحم کرے۔"

"کلکتہ سے واپسی کے بعد سے آج تک تم جانتی ہو کہ میرا نکلنا

بند ہو چکا ہے ۔ ڈگری ہنڈی والے برقندازوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لیے شکاری کتوں کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں ۔ جن تین چار آدمیوں کے یہاں ایک آدھ بار گیا ہوں وہ شہر کی ناک ہیں اور ان تک پہنچنے والی خبریں میری مخبری کی محتاج نہیں ہیں یا پھر تمھارا گھر ہے کہ کبھی کبھی آجاتا ہوں اور یہ تم ہی جانتی ہو کہ کس طرح آتا ہوں ۔ عامیوں سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا جو آج میں ان کی زبانوں سے اشتہار دلاتا ۔"

"آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں اس سے زیادہ کہنے کا حوصلہ رکھتی ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ہی کیوں ؟"

اس نے نگاہ اٹھا کر پورے دیوان خانے کا جائزہ لیا ۔ دوجانہ اور فرخ نگر اور پاٹودی کے نواب زادے اور ان کے مصاحبین اور متوسلین سے بھرا ہوا تھا ۔ لڑکیاں ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں ، منڈلا رہی تھیں ۔ ساز اپنے سازندوں کے انتظار میں خاموش تھے ۔ اس نے چنگیر سے پان اٹھا کر منھ میں رکھا ۔ حقّے کا ایک گھونٹ لیا اور تکیے سے پشت لگا لی ۔

یہ سوال اوروں نے بھی کیا ۔ ہم خاموش رہے ۔ لیکن تم کو جواب ضرور دیں گے ۔ تو سنو ! پورے ہندوستان میں چار شاعر ہیں ۔ لکھنؤ میں ناسخ اور آتش ، دلّی میں مومن اور ذوق ۔ ناسخ بیچارہ استاد زیادہ شاعر کم ، آتش پہلے قلندر پھر شاعر ۔ دونوں فارسی کلام اور کمال سے نابلند ۔ جو کچھ اچھی بری پونجی ہے وہ اردو میں ہے ۔ دلّی میں مومن خاں مومن اسم بامسمّٰی ہے ۔ نہ کسی کی بھلائی میں نہ برائی میں ۔ کوٹھے پر نہ گیا مشاعرے میں

چلا گیا۔ شطرنج نہ کھیلی غزل بنالی۔ نسخہ نہ لکھا شعر لکھ لیا۔ میاں ذوق شاعر بھی ہیں اور قلعے کے استاد بھی ہیں۔ روزمرے محاورے پر عبور رکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے مضامین باندھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی اچھا بھی باندھتے ہیں لیکن ذوق ہوں یا مومن فارسی نظم و نثر سے یا تو علاقہ نہیں رکھتے یا دور کا رشتہ رکھتے ہیں تو میرے سوا کون ہے جس کی فارسی نظم و نثر اہل پارس سے چشمک کرتی ہو اور ہندی کلام کیا غزل اور کیا قصیدہ اہل نظر سے داد نہ لیتا ہو۔ اور یہ بھی کہ خاندانی عزت اور حرمت اور نسبی وجاہت و شرافت میں شاعر بچاروں کو چھوڑیئے وہ جو ریاست فیروزی و فیروز مندی کے نواب ہیں وہ بھی میرے سامنے اپنے کو چھوٹا پاتے ہیں۔ تو بیگم یہ میرا کمال ہے جو میرا دشمن ہے۔ کمال صدقہ مانگتا ہے۔ میرے حاسدوں نے مجھ پر جو تہمتیں باندھی ہیں، جو الزامات لگائے ہیں اور بدنامی و رسوائی کا جو سامان کیا ہے وہ میرے کمال کا صدقہ ہے، میری شہرت کی زکوٰۃ ہے۔ ایک بات اور، جرائم پیشہ جتنی جلدی ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں اور اپنی دوستی میں شریف دشمنی کی حدوں سے گذر جاتے ہیں۔ شریف نہ آپس میں اس طرح چٹ پٹ یار بنتے ہیں اور نہ کمینوں کے خلاف اس طرح کمر باندھ کر متحد ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مٹھی بھر کمینوں کے ہاتھوں شرفا پٹتے رہتے ہیں اور پٹتے رہیں گے۔ اور چغتائی بیگم یہ بھی کہ لال محل جو دلّی میں ایک لال محل ہے اور جس کی آواز کو لال قلعہ مجرا کرتا ہے مفلس اور قلاش غالب کے سامنے کیوں ہاتھ باندھے

کھڑا رہتا ہے۔ تمھاری عنایتیں بھی ہماری دفعات جرم میں اضافہ بن گئیں۔
اور سنئے کہ جامع مسجد کی سیڑھیاں ہوں کہ اردو بازار کے تھڑے کسی نے
کبھی ہم کو جوتیاں چٹخاتے نہ دیکھا ہوگا۔ ہمارے علاوہ کون ہے جو وہاں
کے گروہ بند ملاّنوں سے داد نہ مانگتا ہو اور یہ بھی کہ جس کی گرہ میں پچاس
روپئے ہوئے اس نے ایک عود مشاعرہ برپا کر دیا اور سپاہی بیٹے میاں ذوقؔ
دیوان بغل میں مار پہنچ گئے استادی کرنے اور تو اور جس نے مومن خاں مومن
جیسے نازک مزاج کے پانوں داب دیئے وہی مشاعرے میں کھینچ لایا۔ ہم تو
لال قلعے تک کے مشاعرے میں شرکت سے پرہیز کرتے ہیں تو ہم دلّی کی اس
پنچایت سے باہر ہوئے جو شاعروں کو تاج پہناتی ہے اور منصب بانٹتی ہے۔
اور یہ بھی بہرحال ہماری خطا ہے۔ یہ بھی سن لیجئے کہ شیعہ اس لئے خفا کہ ہم
خلفاء ثلاثہ پر تبرّا نہیں کہتے۔ سنّی اس لئے ناخوش کہ ہم علی علیہ السلام کہتے
ہیں اور اہل بیت کی ثنا کرتے ہیں۔ مولوی کی نظر میں ہم اس لئے کافر کہ
محمود کو ڈاکو اور عالمگیر کو غاصب کہتے ہیں۔ پنڈت اس لئے صورت دیکھنے
کا روادار نہیں کہ ہم بہرحال مسلمان ہیں اور ترک ہیں اور لاکھ بات کی
ایک بات یہ کہ ہم کسی کو فیض نہیں پہنچا سکتے۔ نہ ۔۔۔ کا دربار ہماری دسترس
میں اور نہ کلاں صاحب بہادر کی کچہری اختیار میں۔ یعنی اگر دلّی کی محفل کو
ایک بدن مان لیا جائے تو ہم پر نزلہ گر رہا ہے۔ خدا نے نظر وہ دی کہ فیضی
کی فارسی میں کان نکال لیتی ہے اور تقدیر وہ دی کہ میاں قتیل جیسے لونڈے
کی شان میں قصیدہ لکھنا پڑتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ اس کشورِ ہندوستان

میں بدنصیب کون تو کہو غالب۔

پوری محفل میں سناٹا تھا۔ بیگم نے شراب کی بوتل سامنے رکھ دی۔

"اس کو سرفراز کیجئے"

"اور ہاں چغتائی بیگم .... پوری دلّی میں کون مائی کا لال ہے جو ہماری طرح ڈنکے کی چوٹ شراب پیتا ہو۔ سپاہی بچے ذوق اور میاں مومن کا ذکر نہیں، اس والیٔ ملک کا نام بتائیے جو دلّی میں رہتا ہو اور دلّی میں ہماری طرح بھری محفل میں پیالہ بھرنے کی ہمت رکھتا ہو ـــ حرم میں لونڈے پلے ہیں۔ آہ بیگم یہ وہ علت ہے جس نے ہندوستان سے مسلمان کی سلطنت ختم کر دی۔ ہاں تو حرم میں لونڈے پلے ہیں، اصطبل میں عورتیں بندھی ہیں۔ گھروں میں شراب کی بھٹیاں قائم ہیں۔ جاگیروں پر افیم اور گانجے کی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ ظلِّ سبحانی کی نذر میں بیویاں گذاری جاتی ہیں۔ صاحب بہادر کی دعوتوں میں بیٹیاں پیش کی جاتی ہیں۔ سب سب کچھ کرتے ہیں اور سب جانتے ہیں اور سب کے ایمان سلامت ہیں۔ ایک بدنصیب ہم ہیں کہ گھڑی بھر کی خود فراموشی کے لئے اپنے گھر کا دروازہ بند کر ایک پیالہ حلق میں انڈیل لیں تو ملحد بھی ہم کافر بھی ہم"

"چغتائی بیگم تین تین دن تک ہم اپنی ڈاک نہیں کھولتے کہ معلوم نہیں کس خط میں کس نے ہم کو کتنی گالیاں دی ہوں۔ وہ بڑھے طوطے جن کی گردن میں سونے کے طوق اور پروں پر چاندی کی تحریریں ہیں ہماری انشا کے ایک صفحے کی صحیح قرأۃ نہیں کر سکتے۔ ہماری غزل کی سطح کو چھو نہیں سکتے۔

وہ ہمیں گالیاں لکھتے ہیں اور اتنی گندی کہ اگر کوے سن لیں تو قے کر دیں"۔
محفل کی طرف نگاہ اٹھائی ۔

" عزیزو..... ہم کو افسوس ہے کہ تمھاری موجودگی میں ہماری زبان سے ایسے کلمات نکلے جو عام حالات میں ہرگز نکل نہیں سکتے تھے لیکن کیا کریں ہم بھر چکے تھے آج چھلک گئے ۔ ہم معذرت خواہ ہیں "

اور اس نے پیچوان کی مہنال دانتوں میں دبا کر جنگیر پر ہاتھ ڈال دیا۔

" اللہ میرزا صاحب آپ تو پان پر پان کھاتے جا رہے ہیں "

" بیگم ہم کو آپ کی دلّی کے مہربانوں نے ملحد اور کافر بیشک کہا ہے لیکن ابھی تک کسی نے بے ادب نہیں کہا ۔.. ان بچوں کے سامنے بوتل کو ہاتھ لگانا تہذیب کی نہیں شراب کی بے حرمتی ہے "

اور صفوں میں بیٹھی ہوئی صورتیں جیسے ہلنے لگیں ۔ اس کے اور بیگم کے اصرار کے باوجود ایک ایک صورت نے دیوان خانہ خالی کر دیا ۔ لڑکیاں اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلی گئیں ۔ کچھ سازندے جو دوران گفتگو آ گئے تھے اپنے اپنے ساز لے کر ادھر ادھر ہو گئے ۔ چغتائی بیگم اس کے اور قریب ہو گئیں ۔

" ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں میرزا صاحب ...لیکن آپ کا یہ روپ بھی ہم ہی کو دیکھنے کا حق ہے ..... ہے نا ؟"

" بیشک ہے "

" تو اب جلال تھوک دیجئے ۔ بوتل کھولئے ... کھولئے نا ... آپ کچھ

ہمارے سر کی قسم ۔"

"یہاں سے وہاں تک چھائے ہوئے سناٹے میں ایک قلقل مینا کی آواز تھی ۔ صریر قلم اور قلقل مینا کے بعد چغتائی بیگم کی آواز تھی جس کا وہ عاشق تھا ۔ پھر جیسے کہیں دور سے وہی آواز آنے لگی ۔ روشنائی کی ایک لکیر سی جگمگانے لگی اور اس میں جڑے ہوئے مصرعوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں ۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پردے پڑے تھے چھت میں سجے فانوس چاند تاروں کی طرح منور تھے ۔ قد آدم آئینوں میں بیگم کا پرتو ہلکورے لے رہا تھا ۔ ساز کہیں سے پیدا ہو کر اپنی اپنی جگہ جم چکے تھے آہستہ آہستہ دیکھتے ہی دیکھتے روشن ہونے لگے تھے ۔ لو دینے لگے تھے ۔ اس نے گردن اٹھائی بیگم اس کے سامنے اس کے وجود سے بے خبر اپنے آپ سے بیگانہ ناچ رہی تھیں ۔ طاؤس کی طرح ناچ رہی تھیں ۔ طاؤس ۔ طاؤس کے پانوں طاؤس کا داغ ہوتے ہیں اور بیگم کے پانوں طاؤس کے پروں سے زیادہ قابل پانوں تو چوم لینے کے قابل ہیں ۔ اس نے طبلے پر دھڑکتی انگلیوں کی طرح تھرکتے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے ۔ وہ کسمسانے لگے جیسے ہاتھوں میں سونے کے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں ۔ اس نے دونوں کبوتروں پر اپنی آنکھیں رکھ دیں ۔

"اتنا گنہگار نہ کیجئے میرزا صاحب ۔"

اس تھرتھراتی ہوئی دہکتی ہوئی معشوق آواز نے سسکی لی ۔ زرنگار اطلس کے نیاموں میں بند سنہری شمشیریں اس کی گردن کے گرد ہلنے لگیں ۔ سر اٹھا تو اپنی ہی مستی سے نیم باز آنکھوں کے لال ڈورے خط ساغر کی طرح

چمک رہے تھے۔ باغ آرام کے غنچوں کی طرح ہونٹ کھلے مسی لگے دانتوں کی جھلک دکھائی دی۔

"یہ کیا کیا۔"

"مفلس اور قلاش غالب کے پاس تمھیں نذر دینے کو اور تھا بھی کیا۔"

"میرزا صاحب۔"

"تم وہ قلوپطرہ ہو چغتائی بیگم جو کسی سیزر کو میسر نہ آئی۔ وہ نورجہاں ہو جو کسی جہانگیر کا مقدر نہ ہوئی۔ اس برہنہ سر کی قسم ان طنازپیروں کی ہرگردش کی قسم ہم سچ کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن فن شریف کا بادشاہ تو مل گیا ... غالب تو مل گیا ... مل گیا نا؟"

"غالب تو ایک داغ ہے جسے تم نے اپنے دامن پر قبول کرلیا۔ ایک زخم ہے جو تمھاری آستین پر لگ گیا... نہیں تم نے کاغذ کے ایک پھول کو زندہ کردیا تم نے مٹی کے ایک کھلونے میں روح پھونک دی۔ تم جو کچھ ہو زبان اس کا اعلان کرنے سے قاصر ہے عاجز ہے۔"

پھر وہ منزل آگئی جہاں چلنے کے خیال سے زبان میں آبلے پڑنے لگتے ہیں۔

وہ دن بھی کیسا بھیت دن تھا جس کے تصور سے دلّی ہل رہی تھی۔ میرٹھ اور متھرا اور آگرہ میں پڑی ہوئی تمام گوری پلٹنیں طلب کرلی گئی تھیں۔ جہان آباد کے دہلی دروازے سے کشمیری دروازے تک کا تمام علاقہ چھاؤنی بن گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف انگریز کی ہندوستانی

فوج کی فصیلوں کے پیچھے انگریز سواروں کی دیواریں کھڑی تھیں بگل کی آواز کے ساتھ ہی جنگی گھوڑوں پر سوار انگریز فوجی ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے اس طرح نظر آئے جیسے غنیم پر یلغار کرنے نکلے ہوں۔ ایک رئیس کو پھانسی دینے کے لیے اتنا بڑا انتظام... دلی والوں نے انگریز کی عسکری طاقت کی اتنی بڑی نمائش کاہے کو دیکھی ہوگی۔ پھر پالکی آگئی جس کے پردے بندھے ہوئے تھے اور انگریزی پیادے کندھوں پر اٹھائے چل رہے تھے۔ نواب شمس الدین مسند سے پشت لگائے بیٹھا تھا۔ سبز ریشمی پاجامے پر سبز خفتان پہنے تھا جس کے دامن اور آستین اور شمسے اور گریبان زری کے کام سے دمک رہے تھے۔ سر پر سبز کار چوب کی مندیل دھری تھی۔ سرخ وسفید ہاتھ چاقو سے کیسر رجھیل رہے تھے اور نواب کھا رہا تھا کہیں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں آدمی نہ ہوں، عورتیں نہ ہوں، بچے نہ ہوں مسجدوں کے گنبد و مینار اور درختوں کی شاخیں تک تماشائیوں سے بھری تھیں کشمیری دروازے کے میدان میں سولی لگی تھی۔ دروازے پر توپیں چڑھی تھیں۔ ہزاروں سواروں اور پیادوں کی بندوقیں بھری تھیں اور تلواریں ننگی تھیں اور حد نگاہ تک آدمی کھڑا تھا۔ پالکی رکتے ہی فوجی باجے بجنے لگے۔ اتر کر دو رکعت نماز پڑھی اور چبوترے پر چڑھ کر پھانسی کا پھندہ چوما۔ اور بھنگی کے ہاتھ سے ٹوپ چھین کر خود پہن لیا۔ پھانسی لگتے ہی نواب کی لاش قبلہ رو ہوگئی۔ عوام نے اسے بیگنا ہی کی دلیل جانا اور شہید کا لقب دے ڈالا۔ اللہ اکبر کی آوازوں سے کشمیری دروازہ ہلنے لگا فصیلیں

جلنے لگیں، جہان آباد جلنے لگا۔ مسجد مسجد نماز جنازہ پڑھی گئی۔ کوچہ کوچہ مخبروں کو بد دعائیں دی گئیں۔ احساس مجبوری نے پہلے انگریز کے قاتل کو ہیرو بنایا۔ پھر جب قتل کے جرم میں پھانسی ہوئی تو اپنی بے بسی کو تھپکیاں دینے کے لئے شہادت کا مرتبہ عطا کر دیا لیکن کسی نمک خوار کے منہ سے آواز نہ نکلی، کسی جاں سپار کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔

گلیوں میں گالیاں بجی تھیں، دروازوں پر گالیاں کھڑی تھیں، کھڑکیوں سے گالیاں جھانک رہی تھیں۔ ہواداروں پر گالیاں چڑھ رہی تھیں۔ پالکیوں سے گالیاں اتر رہی تھیں۔ جامع مسجد سے اردو بازار تک گالیوں کے کھوے سے کھوے چھل رہے تھے۔ محفلوں میں گالیوں کی جگالیاں ہو رہی تھیں۔ ڈیوڑھیوں پر ڈاکیے دستک دیتے اور گالیوں کے دونے بانٹ کر چلے جاتے۔ گالیوں کی ایسی گرم بازاری شاید ہی کسی نے کبھی دیکھی ہو۔

ایک دن وہ دروازہ بند کئے اشعار کی صورت میں اپنے بے گناہ زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔ غزل لکھ رہا تھا کہ سرکار کمپنی بہادر کا پروانہ ملا اور اس کی پنشن کا بقایا یک مشت مل گیا۔ اس نے انتہائی ضروری اور خطرناک قرضوں کی ادائیگی کی۔ کوتوالی کے سپاہیوں کے ہاتھوں سے ٹھکرایا چھین کر پھینکیں اور امراؤ بیگم کے پاس بیٹھ کر مدتوں کے بھوکے ننگے اکتیس دنوں کے کالے کوس باسٹھ روپئے کے گز سے ناپتا رہا۔

اس دن کتنے دنوں کے بعد صبح کی تبرید آئی تھی۔ باورچی خانے کو پورا گوشت نصیب ہوا تھا۔ شراب و گلاب کی بوتلیں کھلی تھیں۔ بادام کی

آنکھیں دیکھی تھیں۔ اتنے دنوں بعد اپنی گرہ کی بوتل کھلی تو کیسی مہک اٹھی تھی، کیسا سرور آیا تھا جیسے کنوارے ہونٹوں میں پہلا پیالہ اترا ہو۔ آدمیوں اور عورتوں کی نگاہیں باادب ہوگئی تھیں اور بدن چاق چوبند۔ پورا گھر جیسے نیا نیا ہوگیا تھا۔ دھوبی کے یہاں سے آئے ہوئے کپڑے تک کیسے نئے نئے لگ رہے تھے۔ موسم کے پھلوں میں جنت کے باغوں کی خوشبو تھی۔ باورچی خانے کی طرف سے ہوا کا جھونکا آتا تو بھوک چمکنے لگتی۔ اس روز وہ محلسرا میں بیٹھا دسترخوان لگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بیگم سامنے بیٹھیں پاندان سجا رہی تھیں۔ بی وفادار پانی کا آفتابہ لئے آرہی تھیں کہ ڈیوڑھی سے داروغہ کی آواز آئی اور میاں گھمن کی دولھن نے بادامی رنگ کا ایک لمبا سا لفافہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ اس نے صندوقچے سے چاقو نکال کر لفافہ کھولا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے گلابی باغ میں آموں کی دعوت میں شرکت کا حکم لکھا تھا۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی نہا دھو تبرید سے فارغ ہوئی سے ٹوٹا جوڑا پہن کر تیار ہوگیا تھا اور حقّے کے شغل میں مولانا کی سواری کا انتظار بہلا رہا تھا کہ میاں کلّو نے ہاتھی کے لگنے کی اطلاع دی۔ وہ دو چار گھونٹ لے کر کھڑا ہوگیا۔

ہاتھی ابھی موری دروازے کے سامنے تھا کہ بادلوں نے آلیا چند قدم بڑھے تھے کہ پانی شروع ہوگیا۔ خدمت گار نے چھتری تان لی لیکن اس طوفان کے سامنے چھتری کیا، باغ تک پہنچتے پہنچتے شرابور ہوگیا۔ ہاتھی سے اس طرح اترا جیسے دریا سے نکل رہا ہو۔ گلابی باغ۔۔۔ معلوم ہوتا تھا

لال قلعے کے ولی عہد کی سواری اتری ہو یا کسی والیٔ ریاست کی چھاؤنی پڑی ہو۔ انتظام کا یہ عالم کہ بیوتات خانہ تک برپا تھا۔ خیمے کے اندر پہنچ کر کپڑوں کے بقچے دیکھے۔ محمودی کا کرتا اور مشروع کا پاجامہ پہن کر خاص عمارت میں داخل ہوا تو آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مولانا جھکے ہوئے کھڑے پیشوائی کر رہے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مسند سے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ اٹھنے لگے تو اس نے ہاتھ تھام لیے اور اٹھنے نہ دیا۔ راجہ ناہر سنگھ والیٔ ریاست بلبھ گڑھ نہ مانے اور اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ حکیم آغا جان عیش بھی نظر کے ٹیکے کی طرح جمے ہوئے تھے۔ ان سے ہاتھ چھڑا کر وہ نواب کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ چنگیر پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک طرف سے مغل جان کئی پریوں کو جلو میں لیے نکل پڑیں۔

"مولانائے مکرم آپ کے دوست ہیں۔ پوچھ لیجیے کہ جب دعوت نامہ ملا تو میں نے تصدیق کرائی تھی کہ میرزا نوشہ بھی طلوع ہوں گے یا نہیں اور جب آپ کی شرکت مقرر ہوگئی تب بندی انتظام کو اٹھی ہے۔"

"مغل جان اب اگر تم نے مزید شرمندہ کیا تو میں آغا جان کے سامنے ہی چوم لوں گا.... تمھارے ہاتھ۔"

آگرے کے چاک کی اتری ہوئی، دلی کی کمان پر چڑھی ہوئی اور قلعۂ مبارک کی خاص الخاص محفلوں کی کڑھی ہوئی مغل جان چنگی سے آنچل کی اوٹ بنا کر مسکرائیں۔ قبل اس کے کہ بان چھوڑیں نواب داغ گئے۔

"یہ میرزا نوشہ تم نے ایک ہی فقرے کے عقد میں آغا جان اور

مغل جان اور چوم لوں گا، کیوں کر باندھ دیا؟"

"حضور عقب میں ہاتھ بھی دے رکھا ہے۔"

"عقب کا جواب نہیں۔"

مولانا ہنس پڑے، مفتی صاحب مسکرا دیئے، مغل جان شرما گئیں۔ اور حکیم جی نے نقاہت کا جو خضاب لگا رکھا تھا وہ جگہ جگہ سے کھل گیا اور محفل بے تکلف ہو گئی۔

باغ کے وسط میں خوشبودار درختوں کے نیچے سرخ بانات کا بڑا سا نمگیرہ لگا تھا۔ نیچے سنگ مرمر کی تپائیوں پر سب بیٹھے تھے قلعی دار لگنوں کے برف سے ٹھنڈے پانی میں مہتاب باغ اور قطب کی امرائیوں سے لے کر منڈی تک کے چنے ہوئے آم بھیگ رہے تھے اور پانی کا غبار سا برس رہا تھا کہ نواب تجمل حسین خاں آ گئے۔ خادم کے ہاتھ میں سدھا ہوا چھتر سایہ کئے ہوئے تھا اور وہ آہستہ آہستہ قدم رکھ رہے تھے۔ نمگیرے میں سب ان کے استقبال کو کھڑے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی مغل جان برآمد ہوئیں۔ نواب کو مجرا کیا اور چاقو پیش کیا۔

"آپ کی موجودگی میں بھی چاقو کی ضرورت ہے؟"

نواب کے فقرے پر مغل جان سمیت سب مسکرا دیئے۔ ہاتھ اپنی اپنی پسند کے آم لگن سے نکال رہے تھے اور چاقو چل رہے تھے کہ حکیم جی نواب کے ہاتھ سے آم اور چاقو لے کر خود چھیلنے لگے۔ سب نے کنکھیوں سے دیکھا لیکن چپ رہے۔ سامنے دوسرے نمگیرے کے نیچے بھیگا ہوا لہنگا اور چولی

پہنے ایک لڑکی ناچ رہی تھی جب نواب کا دوسرا آم بھی حکیم جی چھیلنے لگے تو مولانا فضل حق بولے۔

"حکیم صاحب کیا آپ ایک آم بھی نہیں کھائیں گے؟"

حکیم نے چاقو روک کر بہت جما جما کر کہا۔

"جی ہاں مولانا آپ جانتے ہیں میں آم نہیں کھاتا اور میں کیا آم تو گدھا تک نہیں کھاتا۔

"جی ہاں حکیم جی گدھا آم نہیں کھاتا۔"

اور قہقہوں کی بارش میں حکیم جی بھیگ گئے۔ حکیم آغا جان عیش آم چھیلتے رہے، نواب تجمل حسین خاں کھاتے رہے اور چاقو چلاتے چلاتے وہ گنگنانے لگا۔ مغل جان نے اٹھلا کر کہا۔

"کیا پیاری طرز ہے میرزا نوشہ ہمیں بھی تو سنائیے کیا گنگنا رہے ہیں۔"

"سن چکی ہیں آپ۔ پرانی غزل ہے۔ اس کا مصرعہ زبان پر آ گیا۔"

سب متوجہ ہو گئے تو اس نے پڑھا ؎

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

سب حکیم آغا جان عیش کو دیکھ رہے تھے، مسکرا رہے تھے مغل جان نے مچل کر کہا۔

"حق تو یہ ہے کہ اس شعر کے صحیح معانی آج سمجھ میں آئے۔"

"بجا ہے، درست ہے۔"

سب کہتے رہے اور حکیم آغا جان عیش گردن ہلاتے رہے لیکن آم

رہے۔ نواب شیفتہ نے حکیم جی کے مزاج کا ذائقہ بدلنے کے لئے مغل جان سے کہا۔

"بھئی مغل جان بہت دنوں بعد نصیب ہوئی ہو۔"

"اے نواب صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ میری جیسی ہزار مغل آپ پر تصدق۔"

"کوئی اچھی سی غزل سناؤ۔"

"جو حکم۔"

مغل جان کے ہاتھ کا اشارہ ہوتے ہی دوسرے نمگیرے کی لڑکیوں نے ساز اٹھا کر اپنی جگہ سنبھال لی اور مغل جان گھنگھرو باندھ کر کھڑی ہوئیں۔ تو جیسے بدل گئیں۔ ساز کی آوازوں کے جلو میں تان لی تو زمین سے اٹھ گئیں۔ مطلع چھیڑا۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

اتنی استادی سے اور اتنی طرحوں سے بتا بتا کر گایا کہ خود اسے محسوس ہونے لگا کہ مغل جان کسی دوسرے کی غزل کا مطلع سنا رہی ہیں۔ غزل تمام ہوئی تو حکیم جی ڈکارے۔

"بھئی مغل جان کیا پارے کا بدن اور نور کا گلا پایا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ پر لیکن نواب نے اچھی غزل سنانے کو کہا تھا۔ یہ تم کیا لے کر بیٹھ گئیں۔"

"ہاں مغل جان ایسی مشکل چیزوں سے حکیم جی کے سر میں درد ہونے لگتا

ہے۔ کوئی ایسی اچھی غزل سناؤ کہ ادھر تمھارے منہ سے پہلا مصرعہ نکلا ادھر سپاہی پیادوں نے دوسرا مصرعہ خود پڑھ دیا۔ ایک ایک شعر بالکل گھلا ہوا پلپلے آم کی طرح کہ ادھر آواز کی مرکی نے ڈنڑکا توڑا اور ادھر معنی کا رس بھل سے بہا۔"

قبل اس کے کہ بات بڑھے سمجھ دار مغل جان نے شیفتہ کی غزل شروع کر دی اور اپنی آواز کے سیلاب میں ساری کدورتیں بہالے گئیں۔

شام کے وقت پانی کی جھڑی لگی تھی۔ مہکتے ہوئے پکوانوں کے طباق آرہے تھے۔ شربتوں کے کٹورے چل رہے تھے۔ ملائی کی قفلیاں کھل رہی تھیں۔ سب اپنی اپنی پسند کی چیزیں چن رہے تھے۔ لطیفے ہو رہے تھے۔ مزے مزے کی حکایتیں سنائی جارہی تھیں مگر حکیم جی ہر طرف سے آنکھیں بند کئے بجھے بجھے سے حقہ گڑگڑائے جارہے تھے کہ مفتی صدرالدین آزردہ نے چٹکی لی۔

"بھئی حکیم صاحب کچھ منہ سے بولئے کچھ سر سے کھیلئے۔ آپ نے تو چپ کا روزہ رکھ لیا ہے۔"

"چپ کا روزہ کہاں حضور پورے رمضان کا روزہ رکھے ہوئے ہیں۔"

مولانا فضل حق نے ٹھیلا۔

"اب ہم حکیم صاحب کے منہ سے حکایت سنیں گے مغل جان کہاں ہیں؟" نواب تجمل حسین خاں گرجے۔

"جی حاضر ہوئی نواب صاحب"۔

"بہت ہو چکے پکوان ... آئیے حکیم جی کچھ سنانے جا رہے ہیں"۔

"زہے نصیب زہے نصیب۔ بندی تو سر سے پانوں تک سماعت ہی سماعت ہے"۔

اصرار اور مزید اصرار کے بعد حکیم جی نے منھ سے سنہال نکالی۔ تکیے سے ابھرے اور بڑے ٹھسّے سے شروع ہوئے۔

"حضرت محمود اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ تھا"۔

"یہ کون بزرگ ہیں۔ تعارف کراتے چلیے"۔

"واللہ میرزا غالب تم محمود کو نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں.... محمود زنگی کو جانتا ہوں، محمود خراسانی کو جانتا ہوں اپنی دلّی کے حکیم محمود خاں تک کو جانتا ہوں"۔

"اور نہیں جانتے تو محمود غزنوی رحمتہ اللہ علیہ کو نہیں جانتے"۔

"محمود غزنوی کو خوب جانتا ہوں لیکن یہ جو آپ نے رحمتہ اللہ علیہ کا پگڑ باندھ کر اعظم کی طلیسان ڈال دی تھی، اس نے گڑ بڑا دیا"۔

"میرزا صاحب کیا محمود غزنوی کو محمود اعظم رحمتہ اللہ علیہ نہیں کہہ سکتے؟"

"نہیں کہہ سکتے"۔

"میں پوچھتا ہوں کیوں نہیں کہہ سکتے"۔

"اس لیے کہ محمود ایک لیٹرا تھا، بہت ہی بڑا لیٹرا لیکن تھا لیٹرا"۔

"کیا آپ سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہیں مرزا صاحب؟"

"میں آپ کی بات سنجیدگی سے سنتا نہیں ہوں لیکن کہتا ہمیشہ سنجیدگی ہی سے ہوں اور اس وقت تو میں کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں کہ محمود غزنوی لٹیرا تھا۔"

پوری محفل سنبھل کر بیٹھ گئی۔ حکیم صاحب نے زانو سے سٹک کی نَے اٹھا کر پھینک دی اور گرج کر بولے۔

"ذرا ثابت کر کے دکھائیے۔"

"اجی حکیم صاحب وہ سترہ مرتبہ ہندوستان لوٹ کر چلا گیا اور آپ کی نظر میں لٹیرا ثابت نہیں ہوا تو میں بے چارہ کس طرح ثابت کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

"جی ... اس نے سترہ مرتبہ ہندوستان فتح کر کے چھوڑ دیا۔"

"فتح کرنے والے ملک لوٹ کر بھاگ نہیں جاتے سلطنتیں قائم کرتے ہیں، شاہی خاندانوں کی بنیادیں رکھ دیتے ہیں۔ نام گنواؤں۔"

"اچھا چھوڑیئے یہ بحث، آپ اُن کو بہادر مانتے ہیں؟"

"بہادر وہ بھی ہوتا ہے جو شیروں کو نہتّا مار دیتا ہے اور بہادر وہ بھی ہوتا ہے جو تاریخ کے طوفان کے سامنے سدِ سکندری بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان معنوں میں محمود بہادر بھی نہیں تھا۔ جس زمانے میں محمود نے نام کمایا وسط ایشیا میں وہ ایسا ہی زمانہ تھا جیسا ہندوستان میں شاہ عالم وغیرہ کا زمانہ تھا۔ محمود چمک گیا۔ لیکن محمود کا رانا پرتاپ

سے کیا مقابلہ جس نے مغلوں کے مغل اعظم سے ٹکر لی۔ مرتے مر گیا لیکن سر کو جھکنے نہ دیا اور مغل سیلاب کو اپنے بھالے کی نوک پر رکھ لیا محمود کا شیواجی سے بھی کوئی مقابلہ نہیں جس نے اس شہنشاہ کے منہ پر تلوار کھینچ لی جس کی سلطنت کشمیر سے راس کماری تک اور قندھار سے رنگون تک پھیلی ہوئی تھی۔ شیواجی مرا نہیں بلکہ مرہٹہ شاہی کی جسکو آپ مرہٹہ گردی کہتے ہیں بنیاد رکھ گیا۔ اور تو اور میں تو محمود کو راجہ سورج مل سے بھی چھوٹا آدمی سمجھتا ہوں۔"

"بھئی کمال ہے میرزا صاحب۔"

"جی ہاں کمال ہی ہے حکیم صاحب۔ محمود نے سومناتھ فتح کیا۔ ایک دنیا نے گذارش کی لیکن محمود نے اس بت کو جو مندر کی جان تھا توڑ کر پھینک دیا۔ راجہ سورج مل نے آگرہ فتح کیا۔ قلعے میں گھوڑے باندھ دیئے تاج محل میں بھوسہ بھروا دیا۔ چاہتا تو پورا تاج محل کھود کر بھرت پور اٹھالے جاتا لیکن خود اپنے ذوق جمال سے مجبور ہو کر اپنی بڑائی کے آگے جھک کر تاج محل کے ایک پتھر کو بھی نقصان نہیں پہنچایا تو حکیم صاحب تاریخ کو تاریخ کی طرح پڑھا کیجیئے کہ علم نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، علم صرف علم ہوتا ہے۔"

دیر تک سناٹا رہا۔ شیفتہ تک گردن ہلاتے رہے پھر سوچتی ہوئی آواز میں بولے۔

"غالب کی بات کڑوی ہے لیکن سچی ہے.... حکیم صاحب اس کو ہنس

کر ٹالا نہیں جا سکتا۔"

مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین اپنے اپنے پیچوان کڑکڑاتے رہے اور اس کے اٹھائے ہوئے سوالوں کے بھوتوں سے لڑتے رہے۔ مغل جان تک سوچ کے مرض میں مبتلا تھیں کہ صدیوں کے بتوں کو ٹوٹتے دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے سواریاں لگنے لگیں۔ نواب تجمل حسین خاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ تھوڑی دور چل کر بولے" میرزا زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اس ایک بار ملی ہوئی زندگی کو خوبصورتی سے گزارنے کے لئے صرف صاحبِ کمال ہونا ہی ضروری نہیں ہے۔ ضروری یہ ہے کہ آدمی میں تھوڑی سی مصلحت اور تھوڑی سی دور اندیشی ہو، تھوڑی سی خاموشی ہو تو تھوڑی سی چرب زبانی بھی ہو۔ مصلحت سے تمھاری لڑائی اور دور اندیشی سے عداوت ہے۔ جہاں خاموش رہنا چاہئے وہاں دریا بہا دیتے ہو۔ جہاں بولنا چاہئے وہاں سکوت اختیار کر لیتے ہو۔ میر تم سے بڑا نہیں تو تمھارے برابر کا شاعر ضرور تھا۔ وہ تک کہتا ہے ؎

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر

اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

پوری دلّی میں تمھارے کتنے دوست ہیں؟ میں بتلا دوں! ایک۔ صرف ایک۔ آدھا ہیں۔ آدھا اس لئے کہ دلّی میں رہتا نہیں اور آدھی چغتائی بیگم۔ آدھی اس لئے کہ عورت ہے اور شریعت میں عورت کی شہادت آدھی ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگ تمھارے دشمن ہیں۔ کمتر نہ دوست ہیں نہ دشمن۔

وہ بھی اس وقت تک جب تک کسوٹی کسے نہیں جاتے۔ جس دن اس کی نوبت آگئی وہ دشمنوں کی طرف ڈھلک جائیں گے۔ تم حکیم آغا جان عیش کو معمولی سا شاعر جانتے ہو اور یہ سچ بھی ہے لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ وہ لال قلعے کا مصاحب ہے۔ تم یہ جانتے ہو کہ میرزا جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور اکبر شاہ کسی قیمت پر ظفر کو بادشاہ نہیں بنانا چاہتے لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ کمپنی بہادر ظفر ہی کو بادشاہ بنائے گی اور اس لئے بنائے گی کہ اکبر شاہ نہیں بنانا چاہتے۔ اور ظفر جس دن بادشاہ ہوئے اور وہ دن بہت دور نہیں ہے کہ اکبر شاہ بیمار ہیں اور کمپنی بہادر ظفر کے حق میں فیصلہ کر چکی۔"

"واقعی۔"

"ہم قلعے سے گلابی باغ پہنچے تھے۔ ہمارے مخبروں کا کہنا ہے کہ ہفتہ عشرہ بھی گذرنے والا نہیں ہے۔ تو اس دن جس دن ظفر بادشاہ ہوئے حکیم آغا جان عیش ان کی ناک کا بال ہو جائیں گے اور بہر حال دلّی کا بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے ... تم سے یہ سب کچھ کون کہے گا اور کیوں کہے گا؟ لیکن چونکہ ہم کو تم سے ایک خاص قسم کا تعلق خاطر ہے اس لئے ہم نے تم سے اتنا کہہ دیا ورنہ سچ یہ ہے ہم کو تجمل حسین خاں کو بھی تم سے کچھ کہتے ڈر لگتا ہے۔"

"آپ کیا فرما رہے ہیں نواب صاحب۔"

"اس لئے نہیں کہ تم ہم کو کولھو میں پلوا دو گے بلکہ اس لئے کہ ہم تمھیں کہیں کھو نہ دیں اور اس عمر میں نئے دوست کھوئے نہیں جاتے پرانے دوست کھوئے نہیں جاتے۔ لیجئے آپ کی محلسرا آگئی۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا

ہے اس پر غور کیجئے گا۔ لیکن گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے لئے فرخ آباد دلّی کا ایک محلہ ہے اور دلّی فرخ آباد کا دارالحکومت۔ اچھا خدا حافظ۔"

پھر وہ رات بھی آگئی جس کے اندیشے سے راتیں بیقرار تھیں اور دن بے چین۔ ابھی دوپہر رات باقی تھی کہ قلعۂ مبارک کے دونوں دروازوں سے توپیں چلنے لگیں جو اکبر شاہ ثانی کی موت کا اعلان نہیں کر رہی تھیں، ظفر شاہ کو تخت نشینی کی مبارکباد دے رہی تھیں۔ قلعے میں روشنی کا وہ طوفان برپا ہوا کہ آدھا شہر اس کے پرتو سے چمکنے لگا۔ کوئی ایک مکان ایسا نہ تھا جس کے مکین دروازے کے باہر اور چھت کے اوپر نہ آگئے ہوں۔ قلعے کی ایک ایک بات دہلی دروازے سے نکلتی کوٹھوں پر چڑھتی منتظر کانوں تک پہنچ جاتی۔ بڑے بڑے نازک مزاج امیر جو ہوادار پر قدم رکھتے تکلف کرتے اپنے ہاتھوں سے گھوڑوں پر چارجامہ پھینک رکاب میں پانوں ڈالتے ہی کڑکڑا دیتے اور آناً فاناً واپس آکر وہ سب کچھ سنا دیتے جسے بڑے بڑے خبردار سن کر دنگ رہ جاتے۔ ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی لیکن شاہجہانی مسجد کی سیڑھیاں تک نمازیوں سے بھر گئی تھیں۔ پھر خطیب نے ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی کا خطبہ پڑھ دیا۔ وہ ہوادار میں بیٹھا، بیٹھا رہا۔ آدمیوں کا ایک سمندر تھا جو قلعے کے دہلی دروازے کی طرف موجزن تھا کہ چغتائی بیگم کی یاد نے ٹھوکا دیا۔

لال محل کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ دربانوں نے اسے دیکھ کر تذبذب کیا۔ تھوڑی سی مشورت کے بعد اندر جانے دیا۔ ابھی اس نے دیوان خانے میں بیٹھ کر تکیے سے پشت لگائی تھی کہ رات کے ملے دلے کپڑوں میں چغتائی بیگم آگئیں۔ انیندی آنکھوں پر سے زلفیں ہٹائیں مسکرائیں اور جھکیں۔

"تو آخر آج ہماری رات بھی سحر ہوگئی۔" "ایک بات پوچھوں بتائیے گا؟"
اور اس کے پاس آکر ڈھب سے بیٹھ گئیں۔

"پوچھ دیکھئے شاید بتلا ہی دینے میں بھلا ہو۔"

"یہ آپ اتنے لمبے لمبے غوطے کیسے لگا لیتے ہیں۔ ہمارا بس چلتا تو ہم اتنے دنوں میں کتنی ہی بار آپ کی ڈیوڑھی پر اتر چکے ہوتے۔"

"بس چلنے ہی کی تو بات ہے بیگم ورنہ ہم تمھیں کلیجے میں چھپا کر کہیں روپوش ہو چکے ہوتے۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"یہ تو نہیں کہتا کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ بولتا ہوں لیکن کم بولتا ہوں اور تم سے شاید نہیں بولتا۔"

بیگم نے تالی بجائی۔ ایک لڑکی نے پردہ ہٹا کر منھ دکھایا۔ بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

"صنوبر سے کہو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔"

"نواب فرخ آباد کے آنے کی کوئی خبر ہے؟"

"خبر تو کوئی نہیں امید پوری ہے۔ خبرداروں نے رات ہی میں کبوتر اڑا دیئے ہوں گے۔ آندھی طوفان کی طرح آئے تو بھی پرسوں تک پہنچ پائیں گے۔ آئیں گے مقرر کئے بادشاہ سے بنا کر رکھنا ہے۔"

اس نے چغتائی بیگم کی طرف جھک کر پوچھا۔

"کوئی خاص خبر ہے؟"

"خاص خبر نہیں ہے۔ خاص خبریں ہیں۔ کبوتروں کی ٹکڑیوں کی طرح اتر رہی ہیں، اترے جا رہی ہیں۔"

"یعنی۔"

"وہی پرانی لکیر پٹ رہی ہے۔ پرسوں اکبر شاہ ثانی کی طبیعت بگڑی اور پرسوں ہی سے پیغام آنے شروع ہو گئے۔ کل شام خانم طلب کر لی گئیں۔ اسی وقت سے قاصدوں کا تانتا بندھا ہے۔ فلاں دیہات کا قبالہ لکھوا لو، فلاں حویلی خرید لو، فلاں محل میں اتر پڑو کچھ کرو نکاح پڑھا لو۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"جواب دینے کو ہے کیا! ان کے پاس ایک سوال ہے، ہمارے پاس ایک جواب ہے۔"

"ایک بار اور سوچ لیجئے۔"

"آپ کے خیال سے بھی مزید سوچنے کی طاقت نہیں رہی۔"

پردے کے پاس ایک عورت کو دیکھ کر بیگم نے ہاتھ پکڑ لیا۔ کھڑی ہو گئیں۔ اور حکم دیا۔

"ہوادار کو پانچ روپئے دے کر رخصت کر دو۔"

اپنے کمرے کی چلمن اٹھا کر خواص کو حکم دیا کہ تبرید یہیں لگا دے۔

ادتیچے کے نیچے زرد چمڑے کا دستر خوان بچھا اور نعمتیں چن دی گئیں۔

"آپ اپنا ہوادار موقوف کر دیجئے۔"

"تھوڑے دنوں پہلے تک تبرید بند گوشت نصف اور شراب حرام تھی لیکن ہوادار کھڑا رہا کہ پورے گھر کی ویرانی میں یہی تو ایک چوب بستر ہے جو دتی کے عامیوں میں اور ہم میں ذرا سے فرق کو باقی رکھے ہوئے ہے۔"

"میں نے یہ سوچ کر جسارت کی کہ دو سواریاں تو نواب کی کھڑی سوکھا کرتی ہیں۔ دو ایک ہمارے پاس بھی ہیں اور سوار ہونے والے آپ اکیلے۔ نواب مہینوں میں آتے تو سوار بھی ایک ہی آدھ بار ہوتے۔ اس لئے منھ سے نکال دیا۔"

"تم نے سچ کہا... لیکن ابھی پڑا رہنے دو۔"

ناشتے کا دستر خوان اٹھا تو بیگم نے شطرنج بچھالی۔

"تو آج آپ نور جہانی کرنے پر تلے ہوئی ہیں۔ کیجئے لیکن میرا حشر شیر افگن کا سا معلوم ہوتا ہے۔"

"خدا نہ کرے ... نور جہانی کیسی میرزا صاحب اماں نے بڑے چاؤ سے سکھلائی تھی کہ شہزادیوں کا کھیل ہے تو کبھی کبھی خانم کو بٹھا کر دل اٹکا لیتی ہوں۔ آج جی چاہا کہ آپ سے ایک مات کھالوں۔"

"بیگم ... خدا کی قدرت دیکھو لکڑی کی بساط پر نام کا بادشاہ رکھا ہے۔

مردہ بے جان ... لیکن ہم دونوں سارے سموچے زندہ انسان اس کی حفاظت کے لئے دماغ کی چولیں ہلائے ہوئے ہیں ۔ بادشاہ اور پیدل میں بہت فرق ہوتا ہے بیگم ۔"

" فرق تو بادشاہ اور وزیر میں بھی ہوتا ہے ۔"

ہاں وزیر کی بھی ساری چلت پھرت بادشاہ کی ذات تک ہے ۔ بہت دنوں کی بات ہے ۔ اکبر شاہ ثانی مرحوم لال قلعے سے عیدگاہ کے لئے دوگانہ پڑھنے نکلے ۔ تیلی واڑے کے پاس سے سواری گزری ہی تھی کہ کچھ بدمعاشوں نے یونہی شرارتاً دو چار کنکریاں پھینک دیں ۔ اکبر شاہ کی ہر برائی تسلیم لیکن اس میں کلام نہیں کہ نیک آدمی تھا ۔ لیکن بادشاہ تھا ۔ بگڑ گیا ۔ قلعے کے کپتان کو حکم بھیج دیا کہ توپ خانہ لے کر حاضر ہو اور پورا محلّے کا محلّہ زمین کے برابر کر دے ۔ ہم لوگوں نے بھی سنا ۔ جب نماز پڑھ کر واپس ہوئے تو ہنگامہ برپا تھا ۔ درجنوں توپیں گھوڑوں سے کھنچی چلی آ رہی ہیں ۔ انگریز سوار بھری ہوئی بندوقیں چھتیائے محلّے کو گھیر رہے ہیں اور توپوں کے رخ متعین ہو رہے ہیں ۔ جب بادشاہ کی سواری قریب آئی تو بوڑھی بوڑھی عورتیں دودھ پیتے بچوں کو گود میں لے کر ہاتھی کے پیروں پر گر پڑیں ۔ دیر کے بعد خطا بخشی ہوئی اور توپ خانے کو واپسی کا حکم ملا ۔"

" اچھا داستاں گو صاحب لیجئے مات ۔"

" مات کھائے تو مدّت ہو چکی اب تو آپ کی چال دیکھنے کو آنکھیں زندہ ہیں ۔"

"اے بیگم کیا میں اندر آجاؤں ؟"

"آیئے خانم جی آیئے ۔"

اس سے آنکھ ملتے ہی خانم کے چہرے پر ایک سایہ سا آگیا جسے تسلیم کے لئے جھک کر چھپا لیا۔

"اے لو یہاں بھی بساط بچھی ہے ۔ میں تو قلعے سے زچ ہو کر بھاگی تھی ۔"

"خیریت تو ہے ؟"

"فرخ آباد سوار جا چکا ہے نواب کو لینے کہ بادشاہ سلامت انہیں فرزیں بنانے پر تلے بیٹھے ہیں ۔"

"فرزیں ہر چال چلتا ہے خانم جی لیکن ڈھائی گھر کا جواب اس کے پاس بھی نہیں ہوتا ۔"

اور بیگم نے اس کی طرف خاص انداز میں دیکھا اور خانم اپنے پائینچے سمیٹ کر چلنے کو ہوئیں۔

"دستر خوان بچھاؤں ۔"

"کیا تورے باندھ کر لائی ہو ۔"

"لائی تو ہوں بیگم اور اصل خیر سے پورے سات عود باندھ کر لائی ہوں ۔ دالان بھرا پڑا ہے ۔"

"اے تو یہ اتنے لاد کر لانے کی ضرورت کیا تھی"

"اے بیگم خدا سے ڈرو.... میں ناشدنی بادشاہ سلامت سے

انکار کرتی۔ پھر دتی میں کتنے گھر ہیں جہاں پانچ بھی اترے ہوں۔ بڑی بڑی بارگاہوں تک کو پانچ سے ایک بخشش نصیب نہیں ہوا۔"

پھر چلون اٹھا کر بولیں۔

"باہر آیئے گا تو ایک بات کہوں گی۔"

بیگم نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بیگم کو اٹھا دیا۔ دیر کے بعد واپس آئیں تو سامنے کے بجائے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ بے نیازی کے پورے اہتمام سے بولیں۔

"ہمارے محل پر مخبر بٹھا دیئے ہیں کہ آنے جانے والوں کا چہرہ لکھتا رہے۔"

"خانم جی کی خبر ہے۔"

"نہیں شہادت عینی ہے۔ خانم پہچانتی ہیں خود دیکھ کر آئی ہیں۔"

"پھر۔"

"پھر کیا پُھر ایرے غیروں سے نجات ملی۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ مزے سے بیٹھے لکھتے رہو اپنا متھ اور کاغذ کالا کرتے رہو۔"

"یہ تو پیچ پڑے جا رہے ہیں بیگم۔"

"بادشاہوں سے پنجہ ہے تو کیا اتنا بھی نہ ہوگا۔"

دسترخوان سے اٹھ کر کتب خانے میں چلا آیا۔ پسندیدہ کتابیں تک دل کو بہلا نہ سکیں۔ گاؤ پر سر رکھ کر چھت کے نقش و نگار دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں کب سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کتب خانہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور سرہانے

تکیے رکھے تھے۔ وہ صدر دالان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ ایک در سے خانم نکل کر کھڑی ہوگئیں۔ باہری بڑے کمرے سے ساز ملانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"بیگم خواب گاہ میں انتظار کر رہی ہیں۔"

پردہ ہٹا تو جیسے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ صندلی پر بیٹھی چاندی کا پاندان کھولے پان بنا رہی تھیں۔ بازو بند کے کسنوں کے موتی ہل رہے تھے۔ وہ گھاگھرے چولی میں سر سے پاؤں تک زیورات میں غرق تھیں۔ پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ہتھ پھول کے نورتنوں میں "نگاہ الجھ کر رہ گئی آپ تو اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔"

"سورج روز نکلتا ہے لیکن جب نکلتا ہے تو نیا معلوم ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ابھی تمھیں دیکھا ہی نہیں۔"

"اللہ میرزا صاحب آپ تو جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھس جاتے ہیں۔ اتنی عمر آگئی آپ کی نیاز مندی میں اور آپ نے ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔"

"ہاں بیگم سچ کہتے ہیں۔ دوپہر کی دھوپ میں بھی جس نے تاج محل دیکھ لیا وہ سمجھتا ہے کہ تاج محل دیکھ لیا لیکن تاج محل اسی نے دیکھا جس نے بھری چاندنی میں تاج محل کے بدلتے رنگ دیکھے ہیں۔ ہم نے تمھیں دیکھا ہے لیکن ہم نے تم کو کہاں دیکھا ہے۔"

وہ پہلو میں بیٹھ گیا اور اس کے برہنہ بازو پر رخسار رکھ دیا۔

"آج بیگم سے ایک چیز مانگنے کو جی چاہتا ہے۔"

"مانگیے۔"

"دے دیجئے گا۔"

"لال قلعے کے علاوہ آپ جو چاہیں مانگ لیں۔"

"لال قلعہ؟"

"ہاں .... آپ کہیں مانگ بیٹھیں کہ میں بادشاہ سے شادی کر کے لال قلعے کی محفلیں آپ کی گود میں ڈال دوں تو؟"

"بیگم آپ اتنا گیا گزرا سمجھتی ہیں ہم کو۔"

"نہیں .... اپنے آپ کو اتنا مجبور سمجھتی ہوں آپ کے سامنے۔"

"معلوم نہیں تقدیر کون سی کروٹ لے ہم آپ سے محروم ہو جائیں تو محرومی کی سیاہ ابد دراز راتوں کے لئے ایک قندیل دے دیجئے۔"

"آپ نے تو اپنے قصیدے کی تشبیب نثر میں سنا دی۔ میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔"

"بزرگوں سے سنا ہے کہ جب جہاندار شاہ نے لال کنور کا رقص سلطانی دیکھا تو بے حال ہو گیا اور اسی رقص کی خاطر اس نے لال کنور سے شادی کر لی ورنہ قلعے کی کتنی ہی لونڈیاں لال کنور سے افضل تھیں۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے اسی آرزو میں سلگتے رہے کہ زندگی میں ایک بار صرف ایک بار آپ سے رقص سلطانی مانگ دیکھیں شاید نصیب ہو جائے۔"

بیگم سن ہو کر رہ گئیں۔ خاموشی کا نیزہ پرتلی ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر

ــــــکے بعد بیگم نے سر اٹھایا تو چہرہ پتھر تھا۔

"آپ کو یاد ہوگا ہم نے آپ سے کہا تھا ہم آپ کا ایسا رقص دیکھنا چاہتے ہیں جیسا کسی شہزادے اور کسی نواب نے کبھی نہ دیکھا ہو:"

"بیگم اٹھیں اور سوچتے قدموں سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں ایک کنیز گزک کا طباق اور شراب کی بوتل رکھ کر ہٹ گئی۔ وہ پانچواں پیالہ ڈھال رہا تھا کہ ایک لڑکی پردہ ہٹا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔

"بیگم صاحبہ آپ کو یاد کر رہی ہیں:"

ایک سانس میں پیالہ خالی کر کے ڈال دیا اور اٹھ پڑا۔ بائیں باغ کے پہلو میں بنے دو دروں کے اکہرے دالان میں تین کنیزیں ساز لئے بیٹھی تھیں۔ صحنچی پر بھاری پردہ پڑا تھا۔ پردہ اٹھا تو سارے حجاب اٹھ چکے تھے، سارے نقاب گر چکے تھے۔ قد آدم شعلۂ بدن پر کسی لباس کا کوئی فانوس نہ تھا۔ سرخ رنگ نے بدن پر ایک خیالی محرم ڈال دی تھی اور برگ انجیر باندھ دیا تھا۔ رنگ کے علاوہ پورے جسم پر اگر کچھ تھا تو گھنگھرو جو اس کی نگاہ کے لمس سے کسمسانے لگے چھنکنے لگے اور ساز کی سنگت میں اڑنے لگے۔ اوپر اٹھتے تو آسمانوں کو زیر کر دیتے۔ نیچے اترتے تو زمین کے جگر تک تیر جاتے۔ وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا۔ بصارت کے ساتھ سماعت بھی یقین وایقان کی منزل سے گزر گئی تھی۔ اس کی آواز غنا کے سوا جو کچھ تھا ہیچ تھا اس جلوۂ عریاں کے علاوہ جو کچھ تھا عدم تھا۔ اب تک کی پوری زندگی کا ہر عیش دید و صدا کی اس کسوٹی پر جھوٹ تھا

بہتان تھا، الزام تھا۔مٹھی بھر کھنکتے دمکتے لمحے وہ خزانۂ نور تھے جس کے ایک تار کا نام ازل تھا اور دوسرے کا ابد۔۔۔۔

حواس ٹوٹ کر بکھر جاتے، اعصاب مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ اگر وہ تھم نہ جاتیں، اگر وہ رک نہ جاتیں۔ اس نے دونوں کلائیاں تھام لیں اپنے ہونٹ رکھے تو یقین آیا کہ وہ زندہ ہے۔ شاید ہی کبھی زندگی اتنی حقیر معلوم ہوئی ہو۔

دسترخوان لگنے کی اطلاع کی تکرار پر وہ حجلۂ رقص سے باہر نکلا جیسے آدم خلد سے نکلے تھے۔ بیگم کے پہلو میں بیٹھتے بیٹھتے جیسے کسی نے املا بول دیا۔ بیگم مقطع نذر ہے۔

مقطع؟

ہاں مطلع بے محل ہے۔ سنئے ؎

ہاں غالب خلوت نشیں بیم چناں عیش چنیں

جاسوس سلطاں درکمیں معشوق سلطاں دربغل

بیگم نے غوری سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ایک بار پھر پڑھئے"

اس نے پھر پڑھا۔

وہ بار بار پڑھواتی رہیں ــــ وہ پڑھتا رہا۔

قلعے میں تیسری نوبت بج رہی تھی جیسے بھکاری پیٹ کے لئے صدائیں بیچتے ہیں اور سامنے دروازے کے گھونگھٹ پر انگریز سپاہیوں

گارڈ کھڑا تھا جن کے اونچے سیاہ چمکدار ٹوپوں میں پر لگے تھے۔ سرخ بانات کے کوٹ دوہرے سنہرے بٹنوں سے جگمگا رہے تھے۔ سفید کھڑکھڑاتی برجس کے سیاہ چمڑے کے ساق پوش میں صورت دیکھی جا سکتی تھی اور سیدھی تلواروں کے صلیبی قبضوں میں خوف و دہشت کے آشیانے تھے۔ اور ان کے سروں پر وہ پرچم لہرا رہا تھا جس کے سایۂ اجلال میں وسط ایشیا سے برہما تک ایک جہان آباد رہ چکا تھا اور جو آج کھسوٹے ہوئے کفن کے ایک چیتھڑے کی طرح جھول رہا تھا اور جس کا مدتوں سے گہنایا ہوا سورج خود اپنے ایوانوں کو منور کرنے سے عاجز تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہیبت ناک فصیلوں کے بوڑھے برج نامہربان زمانے سے ہار کر بیٹھ گئے تھے جیسے مغل جبروت و جلال کے آخری سپاہی خود اپنے خون میں نہائے ہوئے خدائے بزرگ و برتر سے خود اپنی جان کی امان مانگ رہے ہوں۔ دروازے کی دیو پیکر محراب عظمتِ پارینہ کی جلیل الشان یادوں کے بارِ گراں سے جھک گئی تھی جس کے مغرور ماضی نے بڑے بڑے شہریاروں اور کشورکشاؤں کو اپنے آستانۂ مبارک پر سربسجود دیکھا تھا اور اب ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے خمیازۂ خمار میں مبتلا تھی۔ نادری تلواروں کی چمک اور ابدالی سواروں کی کڑک انگیز کر چکی تھی غنیم مرہٹوں اور سکھوں کی ستمرانیوں اور عزیز راجپوتوں اور جاٹوں کی چیرہ دستیوں اور رقیب گوروں کی فتحیابیوں کے جلوس گزر چکے تھے۔ بد اقبال تخت نشینوں کی خرمستیوں، بداعمال وزیروں کی نمک حرامیوں اور بدکردار امیروں کی

غداریوں کے تماشے ہو چکے تھے لیکن نہ آسمان ٹوٹا اور نہ زمین شق ہوئی۔
اگر دلی بھی غرناطہ و بغداد کی طرح ایک ہی رات میں بے چراغ ہو گئی
ہوتی تو کسی عبدالرحمٰن کے کلیجے سے وہ آہ نکلتی کہ زمین پر زلزلہ آجاتا۔
کسی ابن بدروں کی آنکھ سے وہ آنسو ٹپکتے جن کے ماتم میں مدتوں آسمان
سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرا کرتے۔ لیکن دلی میں تو آج بھی سب کچھ تھا
اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اسی سب کچھ ہونے اور کچھ بھی نہ ہونے کی
کشمکش کا نام ہی تو دلی تھا۔

اس نے بدرنگ محراب پر نگاہ کی۔ وہ سرخ رنگ جو شہنشاہی کی
علامت تھا، اڑ چکا تھا، مٹ چکا تھا۔ دروازے پر چڑھی ہوئی پرانی
کالی توپ کی چوبیں بیٹھک پر ایک دبلا پتلا بوڑھا سپاہی بدرنگ
بانات کی ڈھیلی ڈھالی پرانی قبا پر دھندلے کام کا خالی کمر بند پہنے
انگلی سے چونا چاٹ رہا تھا اور توپ کی نال کے نیچے رکھے ہوئے سرخ
پنجرے میں بند طوطی اپنا وظیفہ پڑھ رہی تھی۔ دفعتًہ وہ اپنے تخیل کی
رسائی پر تڑپ گیا۔ پھر اس نے اپنی قبا کے بند درست کئے اور تخیل
کی سرزنش کی۔ لیکن تخیل نے اس کے شانے پر تھپکی دی کہ تم فن کار ہو۔
عظیم فن کار اور میں تمہارا جن ہوں اور مجھ پر وہ تحریر بھی فاش ہے
جو لوح محفوظ پر مرقوم ہے۔ یہ توپ نہیں انگریز کی طاقت ہے، یہ لال
پنجرہ نہیں، لال قلعہ ہے اور اس میں بند طوطی انگریز کی پنشن خوار ہے۔
اور یہ بوڑھا سپاہی ہندوستان کا مفلوج عسکری نظام ہے اور اب وہ

اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے محراب کے نیچے سے گذر رہا تھا اور تاریخ کے زرنگار کارواں اور لہو چکاں قافلے ذہن میں گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اب وہ بودے سپاہیوں اور بھدے چیلوں کی دو رویہ قطاروں سے گذر رہا تھا جن کے چہرے بے رنگ، بدن بے ڈھنگے اور ہتھیار بے آبرو تھے۔ شمالی دیوار سے لگے کچھ گھوڑے کھڑے تھے جن کے چار جامے پیٹ کے نیچے لٹک رہے تھے اور ڈھیلی ڈھالی گردنیں میں گردنیں جھول رہی تھیں اور مری مری دمیں مکھیاں اڑا رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی راستہ ہے جہاں سے کل ملک الشعراء کلیم کی سواری گذری تھی جس کے ایک شعر پر شاہجہاں نے منھ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ اشرفیوں میں تول دیا تھا۔ کلیم تم خوش نصیب تھے کہ عہد شاہجہانی میں پیدا ہو لئے۔ اگر ہماری طرح تم کو بھی یہ پُرآشوب زمانہ نصیب ہوا ہوتا تو تم ہم سے بھی بدتر ہوتے۔ فن کار کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے یا اپنے وقت کے بعد پیدا ہو۔ سامنے نوبت خانے پر نوبت بج رہی تھی جیسے بھکاری پیٹ کے لئے دعائیں بیچتے ہیں۔ اس سے آگے مشہور عالم لال پردہ کھنچا ہوا تھا۔ پہرے پر کھڑی تلواریں زنگ آلود تھیں۔ کمزور شانوں پر لدے ہوئے گرز کی قلعی اتر چکی تھی اور وہ اس پردے پر انگریز کی گولیوں کے مرہم نشان دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف سلاطین کا ہجوم تھا جن میں ایک بوڑھا آدمی دوسرے بوڑھے آدمی کے مونڈھے پر ہاتھ رکھے تخت طاؤس کی قسمیں

کھا رہا تھا۔ دونوں کا قیافہ بد اور حلیہ خراب تھا کہ نقیب کی آواز بلند ہوئی۔ کمزور آواز میں جھولتے ہوئے بے مغز الفاظ اس طرح سماعت سے ٹکرائے جیسے بوڑھا لُہار گھن چلا رہا ہو۔ کیا یہ وہی آواز ہے جس کے بلند ہوتے ہی بڑے بڑے لشکر شکن سپہ سالاروں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں۔ تاہم وہ ہوشیار ہو گیا۔ سامنے چاندی کے تخت پر ایک بوڑھا ہڈیوں کی مالا کسی مقتول بادشاہ کا اترا ہوا تاج پہنے کپڑوں کی طرح بیٹھا تھا اور وہ ایوان جلیل جس کا شمار عجائبات عالم میں ہوا کرتا تھا اس طرح اجڑا اکھڑا تھا جیسے کسی ساحر کے طلسم نے کسی شہنشاہ کو برہنہ کر دیا ہو۔ اب وہ خاص برداروں کی معمولی عباؤں اور میدانِ جنگ کے معرکوں کی آگ سے محفوظ نمائشی تلواروں کے حصار میں گھرا ہوا اس باغ سے گذر رہا تھا جس کا سبزہ بے آب پھول بے رنگ اور درخت بے ثمر ہو چکے تھے۔ اسے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہوئے شامیانے میں انتظار کھینچنے کا حکم ملا۔ جہاں گم نام ناچنے والوں کے طائفے خوش فعلیاں اور معمولی کلاونتوں کے قبیلے گستاخیاں کر رہے تھے۔ سیڑھیوں کے اوپر مقربین بارگاہ کا ہجوم تھا جن میں سپاہی بھی تھے، امیر بھی تھے، وزیر بھی تھے لیکن اکثر فن سپہ گری پر تہمت، منصب امارت پر الزام اور مرتبہ وزارت پر بہتان نظر آتے تھے۔ ان میں بھڑکدار کپڑوں اور چمکدار ہتھیاروں کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو مشترک تھیں جیسے خبیث اور لالچی چہرے، حریص اور مکار آنکھیں، جھوٹی اور سازشی نگاہیں اور چالاک

صفات عالیہ سے محروم تھے۔ وہ اسی کی طرح مجبور اور مغموم اور کھڑے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کردار کی وہ شرافت اور طہارت جو قوموں کی بقا کی ضمانت دار ہوتی ہے، کیا آدمیوں کے اس گروہ سے رخصت ہو چکی۔ وہ بے پناہ خود فراموشی اور بے محابا وفاداری جو سپاہی کی آنکھ میں ستارے جلا دیتی ہے کس زمین کا پیوند ہو گئی۔ علم پر مہارت اور فن پر قدرت جو شخصیت کو خود شناسی اور خود اعتمادی عطا کرتی کس جہنم کا کندہ بن گئی۔ قومی دردمندی اور اجتماعی غیرت جو قلمدان وزارت کو لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی کس آسمان میں کھو گئی۔ اس نے نیم آستین سے رومال نکال کر آنکھیں خشک کیں اور اس مرد کو دیکھنے لگا جو عورتوں کے کپڑے پہنے، پٹکے میں خنجر لگائے اور چوٹی میں کلابتو کے پھولوں کے گجرے سجائے اس گلال بار کے سامنے نرت کر رہا تھا، جہاں تک پہنچتے پہنچتے ہفت ہزاری منصب داروں کے اعصاب ٹوٹ جایا کرتے تھے اور تخت کے کھلے تابوت میں مردے کی طرح بیٹھا ہوا بوڑھا آدمی خوش ہوا۔ رخساروں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیوں کے نیچے دور تک مسکراہٹ نے قوسیں بنا دیں۔ گھنے ابروؤں کے نیچے شکنوں کی چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ بوڑھی غلافی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بڑی بڑی انگوٹھیوں سے سجی ہوئی لرزتی انگلیوں نے پان کی گلوری عطا کی اور اس عجیب و غریب مخلوق نے حاجب کے ہاتھ سے گلوری لے کر آنکھوں سے لگائی، سر پر رکھی اور لمبے چوڑے کاغذی القاب میں لپٹے ہوئے روکھے سوکھے

منصب داروں اور وزیروں کی مبارکبادیوں کے شور میں شرابور ہوتی، نرت کرتی اپنے مقام پر کھڑی ہوگئی اور جیسے کسی نے اس کے داہنے کان پر اپنے لب رکھ دیئے۔ کیا یہی شخص تمھارا ممدوح ہے ؟ تمھاری ہزار سالہ تاریخ کا امانت دار ہے ؟ صدیوں کی کمائی ہوئی گنگا جمنی تہذیب کا نگہبان ہے، علوم و فنون کا مربی ہے، مرجع خلایق ہے۔ کاش تمھارا قصیدہ نگار قلم سوکھ جاتا۔ کاش تم اس بے نظیر بشت پہل تمدّن کے مرثیہ نگار ہوتے۔ یہ کون سا عالم ہے کہ موجود ہوتے ہوئے بھی معدوم ہے اور معدوم ہوتے ہوئے بھی موجود ہے۔ موجود پر مرثیہ کس طرح لکھا جائے۔ تمھاری تشبیب جو عرفی کی گوہر نگاری سے چشمک کرتی ہے۔ کیا اس کے ذہن نارسا کی پستی تک اتر سکتی ہے اور اگر یہ سب کچھ ہو بھی لیا تو خون جگر کی یہ سبیل جو تم نے لگائی اس کی قیمت کیا پان کی صرف ایک گلوری ہے۔ پھر نقیب کی آواز بلند ہوئی اور دو عصا بر داروں نے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔ گلال بار کے سامنے پہنچ کر اس نے سات سلام کئے۔ اپنے ضمیر پر اپنے ہاتھ سے سات تازیانے لگائے۔ اپنی بلبلاتی مفلسی پر سات تھپکیاں دیں اور حاجب نے اعلان کیا۔

"میرزا اسد اللہ خاں غالب"

اس نے خفتان کی جیب سے رومال نکالا۔ دونوں ہاتھوں پر نذر رکھی اور گلال بار کی طرف چلا۔

"باادب .... روبرو .... قبلۂ عالم و عالمیان"
نقیب کی آواز کا کڑکا اس کے پیروں میں الجھ گیا جیسے ایک بر کے سبز مشروع کے پائجامے کے پائنچوں نے اس کی پنڈلیوں کو جکڑ لیا ہو لیکن اس نے مصنوعی فضا سے برستے ہوئے جھوٹے جلال کو جھٹک دیا ذرا سا خم ہو کر تسلیمات پیش کیں اور نذر گذار دی۔ بادشاہ نے رومال پر ہاتھ رکھ دیا۔ داروغۂ نذر و نثار نے نذر اٹھا لی متصدی نے اندراج کر لیا۔ بادشاہ نے نگاہ کی جو نگاہ سے کم تھی۔ اشرفیوں کے ڈھیر کو ڈھونڈھنے والی نگاہ لفظوں کے تانبے پیتل سے بے نیاز نگاہ اسے چھوتی گذر گئی۔

"تمھارے کلام سے جشن تہنیت تک محروم رہیں گے"
ظلِ سبحانی نے فرمایا۔ آواز میں دریغ کی کھرچن کی کھرج تھی۔ بڑھے ہاتھ زانوؤں پر چلے گئے۔ وہ تسلیم کو جھک گیا۔ الٹے قدموں واپس ہوا۔ داروغۂ جلوس و دربار اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ضروری سوالات کرتا رہا۔ اس کی زبان جواب دیتی رہی، ذہن کوڑے مارتا رہا، خفتان کی جیب میں رکھا ہوا قصیدہ اس کے پہلو میں خنجر کی نوک کی طرح چبھتا رہا۔ لال پردے سے قدم نکالتے ہی دربار دار گدھوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے۔ اس نے جیب سے پیٹ کی دو چار بوٹیاں نکال کر اپنی آبرو بچالی۔

وہ اپنی محلسرا کے دوہرے دالان کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ بی وفادار نے لپک کر بیچ کا دروازہ کھول دیا۔ بیگم جانماز پر آنکھیں بند کئے

بیٹھی آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ تسبیح کے دانے ایک ایک کر کے گر رہے تھے۔ چُنے ہوئے آسمانی دوپٹے کی داؤنی میں لُٹتا ہوا لال بھبھوکا چہرہ آج بھی جھمجھما رہا تھا۔ وہ دیر تک اسی طرح کھڑا دیکھتا رہا۔ تسبیح ختم ہوتے ہی سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ کھڑی ناک کے نیچے ترشے ہوئے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس احساس سے کہ پوری دنیا میں ابھی کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو اس کی سلامتی کے لئے اپنے آپ سے گذر سکتی ہے۔ اس کا سارا وجود طمانیت سے چھلکنے لگا۔ محسوس ہوا جیسے جانماز پر اس کی بیگم نہیں، اس کی ماں بیٹھی ہوئی ہیں اور اس کے خدائے ذوالجلال سے دعائیں مانگ رہی ہیں۔

"قصیدے کی پیشکش مبارک ہو۔"

بیگم کی انگلیاں جن کے پور پور سے محبت ٹپک رہی تھی اس کی نیم آستین کے تکمے کھول رہی تھیں۔

"معصوموں اور پرہیزگاروں کی معصومیت اور پرہیزگاری کو سلامت رکھنے لئے جھوٹ بولنا بھی عبادت ہوتا ہے۔" اور گز بھر اونچے گاؤ تکیے کے سہارے ڈھیر ہو گیا۔

"اللہ اس قدر چپ چپ کیوں ہیں آپ۔ کچھ منہ سے بولئے نا۔ اگر انعام واکرام کسی کا نیگ نچھاور ہو چکا ہو تو۔"

"بیگم۔"

آواز دانتوں میں کھنچ کر رہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"آج دربار ملتوی ہو گیا"
"کیا نصیب دشمناں..."
یہ الفاظ چیخ کی طرح نکلے۔
"ہاں.... ظل سبحانی کچھ بیمار ہیں"
اس نے تسلی دی اور نیم آستین اتار دی۔
"چلئے اچھا ہوا.... دیر آید درست آید"
جیسے زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے۔

دن بسر ہو رہے تھے لیکن یوں کہ تبرید ہے تو گوشت نہیں۔ راتیں کٹ رہی تھیں تو اس طرح کہ شراب ہے تو بادام نہیں۔ اور وہ باسٹھ روپلی کی ڈگڈگی پر تیس دنوں کی تین سو ضرورتوں کے بندر نچاتا رہتا۔ جب تھک جاتا تو چغتائی بیگم کی معطر زلفوں کی چھاؤں میں سو جاتا۔ جب لونڈیوں کی نظریں گرنے لگتیں تو اٹھ کر اپنے اجاڑ دیوان خانے کی بربادی کا ایک حصہ بن کر پڑ رہتا۔ اس دن بھی وہ تنہا اپنے گاؤ تکیے سے لگا داستان پڑھ رہا تھا کہ منشی مہرالاسلام آگیا۔ پست آدمیوں کے مذاق کی طرح پستہ قد، ٹھگوں کے دلوں کی طرح کالا رنگ، پورے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سانپ جیسی نمایاں آنکھیں مسکراہٹ خباثت میں سنی ہوئی، ہونٹوں کے گوشے میں خباثت میں سنے ہوئے، خاندانی سائیسوں کی طرح ٹیڑھی ٹیڑھی پنڈلیوں پر سوتی پائجامہ منڈھا ہوا۔ پرانے ولایتی کپڑے کا اونچا

اونچا کفتان جیسے کسی مرے ہوئے گورے کا برانڈ کوٹ کٹوا کر گھر میں سلوا لیا ہو۔ کراری آواز میں کڑک کر سلام مارا جیسے قلعے کا توپچی سلامی داغ رہا ہو۔ بیٹھتے ہی بیٹھتے شروع ہو گیا۔ لہجہ ایسا کہ جس سے خوشامد نے سبق پڑھا ہو۔ لفظ ایسے چکنے کہ انگریزی کارتوسوں کی چربی کھردری معلوم ہو۔ اتنے میٹھے کہ مٹھاس سے لب بند ہو جاتے۔ بات بات میں انگریزی کے لفظ گتھے ہوئے جیسے اردو بازار میں کرشتان تلنگے پریڈ کر رہے ہوں۔ ہر فقرہ "گنی کہ" کے تکیہ کلام کے پٹے میں بندھا ہوا۔ جب باتوں کا پٹارہ خالی ہو گیا تو چلا گیا۔ دوبارہ آنے کے لئے ہفتے عشرے میں ایسا سبز باغ دکھایا کہ وہ رام ہو گیا۔ برابر کا کمرہ کھول دیا۔ اسی جیسے حلیے اور قیافے کے لوگ آنے لگے۔ پانسہ پھینکتے، ہارتے جیتتے جب چلنے لگتے تو دس پانچ روپئے سامنے رکھ کر چلے جاتے۔ اس کا جی چاہتا کہ روپئے ان کے منھ پر مار کر کھڑے نکال دے۔ لیکن کبھی اپنی اور کبھی دوسروں کی ضرورتیں اس کی زبان پکڑ لیتیں منتیں کرتیں اور روپئے اٹھا کر بلبلاتی ضرورتوں کی گود میں ڈال دیتیں۔ اٹھتے بیٹھتے جب ان روپیوں کا خیال آتا تو وہ سوکھ جاتا، اپنی نگاہ سے آپ گر جاتا لیکن ان کے بند ہو جانے کے خوف سے بھی کانپ اٹھتا کہ بہرحال زندہ رہنے کے لئے چٹکی بھر راحت اور مٹھی بھر فراغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کا اندھیرا کم ہونے لگا تھا کہ وہ ہو گیا جس کا اسے خواب میں بھی اندیشہ نہ تھا۔ کوتوال اس طرح آیا جیسے حکیم آغا جان عیش کا داماد ہو۔ منصف نے وہ برتاؤ کیا جیسے نواب شمس الدین کا

سمدھی ہو۔ کیسے کیسے آشنا چہرے نا آشنا ہوگئے، اپنے بیگانے ہوگئے۔ بیگانے دشمن اور دشمنوں کے گھر میں چراغاں اور محفلوں میں جشن پشتوں کی آبرو گھڑیوں میں خاک ہوگئی۔ ایک عزت کے علاوہ اس کے گھر میں تھا کیا۔ جب اس کا جنازہ جیل، جانے کے لیے نکلا تو دنیا اندھیر ہوگئی۔ غالب جس نے ساری غربت کے باوجود دلی کالج کی پروفیسری پر اس لیے لات مار دی کہ انگریز پرنسپل پیشوائی کے لیے ہوادار تک نہ آیا، دو پیسے کے تلنگوں کی حراست میں جیل چلا گیا۔ جیل کے دروازے پر چغتائی بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں کہ میرزا تم تو کہتے تھے کہ مقدمے میں جان نہیں ہے۔ بہت ہوا تو سو پچاس روپیہ جرمانہ ہو جائے گا۔ یہ چھ مہینے کی قید کا حکم کیسے ہوگیا۔ ترسم خانی ترکوں کی تاریخ میں یہ سیاہ ورق کس نے لکھ دیا۔ جیل میں قدم رکھ کر اپنے ویران گھر کی آبادی اور اس کے آرام کا احساس ہوا۔ جیل میں قیدیوں کی اولاد جب ان سے ملنے آتی تو وہ سوچنے لگتا کہ زندگی کی اس سہل الحصول نعمت سے بھی وہ کیوں کر محروم رہا جو بھکاریوں تک پر ارزاں کر دی گئی۔

امراؤ بیگم کا کھانا اسی طرح رکھا تھا کہ چغتائی بیگم کا پورا نعمت خانے کا نعمت خانہ آگیا۔ جیل کے باہر اپنے دوستوں کی دعوت کے متعلق سوچتا رہتا۔ صرف سوچ کر رہ جاتا۔ توفیق نہ ہوتی کہ کبھی ان کو اپنے گھر بلا کر اپنی مرضی کے مطابق ایک وقت کھانا کھلا دے۔ جامع مسجد سے گزرتا اور بھکاریوں کو روٹی مانگتے دیکھتا تو کس طرح بیقرار ہو جاتا۔ وہ دل

جو کسی کا دست سوال نہ دیکھ سکے اپنے ہاتھ کی درازی پر کس طرح تڑپ کر رہ جاتا۔ اٹھ کر قیدیوں کو بلا لایا۔ وہ اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ اس کے خود کے حصے میں جیل کی روٹی آئی۔ دن اپنے کپڑوں کے جوئیں مارتے اور دوسرے کے زخموں کا درد بانٹتے گذر جاتا لیکن رات سولی کی رات بن کر آتی جس پر وہ صبح تک ٹنگا رہتا۔ وہ بھی ایسی ہی رات تھی جب حافظ آکر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"اتنے بڑے فن کار ہو کر غم کا ماتم کرتے ہو۔ غم وہ آیت ہے جو ہم نابغانِ دہر پر آسمان سے اتاری گئی۔ غم وہ سرخ رنگ ہے جو صرف ہم بادشاہوں کو زیب دیتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا غم ہمارے دامانِ دانش کا ایک گوشہ ہے۔ اسد اللہ خاں غالب اگر تم ایسے نہ ہوتے تو ہمارے قبیلے میں نہ ہوتے۔ ڈرو اس وقت سے جب تقدیر تم پر نامہربان ہو کر تمھاری گردن میں سونے کا طوق اور پشت پر زربفت کا پالان ڈال کر تمھیں گدھوں کے ریوڑ میں ہانک دے بلکہ آج کا قلم تمھارے ہاتھ میں ہے۔ آج کی لوح تمھارے زانو پر ہے۔ مرتبہ تمھاری روشنائی کا غم اور عیش تمھاری تحریر کا جاذب ہے۔"

لسان الغیب غائب ہو گئے اور اپنے ساتھ اس کا سارا تاسف اور تکدر بھی لپیٹ لے گئے کتنے دنوں بعد اس نے نیند کی دلداری اور خوابوں کی ناز برداری کی۔ سو کر اٹھا تو دھوپ کا سنہرا رنگ بھلا معلوم ہوا۔ کثیف ہوا کی سرج سے بھی بدن لہلہانے لگا۔ ضروریات سے فارغ

ہو کر وہ بیٹھا ہی تھا کہ جیلر آگیا۔ پہلی بار سلام کیا اور اس انداز سے کیا جو سلام کا حق ہوتا ہے۔ کچھ کاغذات پر دستخط لئے، سامان بندھوایا اور اس طرح اچانک آزاد کر دیا جس طرح وہ قید ہوا تھا کہ منصف کا حکم ثانی یہی تھا۔

جیل کے دروازے پر سواری کی فکر میں غلطاں کھڑا تھا کہ شانے پر کسی نے ہاتھ کا کنول رکھ دیا۔ چغتائی بیگم نے برقعے کی نقاب الٹ دی۔ ملازم سامان دو کڑی میں رکھنے لگے۔

" اگر ہم جیل نہ آتے تو آپ کو اس روپ میں کیوں کر دیکھتے "۔

اور ان کے چہرے کا تناؤ کھلکھلانے لگا۔ گاڑی کے پردے گرتے ہی اس نے برقعہ اتار دیا اور باہوں میں ایک دریائے حسن موجیں مارنے لگا۔

"آپ نے اگر ہم کو اپنا سمجھا ہوتا تو ہم سے مقدمے کی خرابی اس طرح چھپا کر نہ رکھتے۔ شاید کمپنی بہادر کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ منصف نے خود اپنے اولین فیصلے کو اپنے ہی حکم ثانی کے ذریعے رد کر دیا۔ اگر یہ ہو سکتا ہے جو ہوا تو حکم اول لکھنے والا قلم کیا کچھ نہ لکھ سکتا تھا۔ کاش آپ نے ہم سے اس طرح حیا نہ برتی ہوتی۔ نوّے دن نوّے راتیں کیسے کیسے منھ کیسی کیسی باتیں۔ کان سڑ گئے کلیجہ پک گیا۔ اگر آپ کی رہائی کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو کہیں منھ کالا کر جاتے "۔

دہلی دروازے پر کرائے کی فینس میں بٹھا کر رخصت کر دیا کہ امراؤ بیگم

انگاروں پر لوٹ رہی ہو گی۔ امراؤ بیگم نے دیکھا تو جیسے سکتا ہو گیا۔ پھر اٹھیں اور لپٹ کر رونے لگیں۔ بے حال ہو گئیں۔ جب ذرا سنبھلیں تو آدمی بھیج کر حجام کو محلسرا میں بلا لیا۔ اس نے اپنی صورت دیکھی تو اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ کراہت ہونے لگی۔ کیا یہ وہی صورت ہے جس پر چغتائی بیگم جیسی قتالۂ عالم نے لال قلعہ قربان کر دیا۔ بہت بے وقوف ہے چغتائی بیگم۔ بہت باوفا ہے چغتائی بیگم۔ وہ آئینے میں بیٹھے ہوئے پچاس سال کے بوڑھے بدنام مکروہ چہرے پر تھوکتا رہا اور حجام انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے سنا۔

"سر کے بال مونڈ دو.... اور داڑھی برابر کر دو۔"

پردے کے پیچھے امراؤ بیگم کی آہٹ ہوئی اور عارف نے تڑپ کر پوچھا۔

"یہ سر کیوں منڈوائے ڈال رہے ہیں آپ؟"

"ہندوؤں میں طریقہ ہے کہ جب ان کا کوئی بزرگ مر جاتا ہے تو وہ اپنے سارے بال منڈوا کر سوگ کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم نے تو ان دو ہاتھوں سے اپنے تمام بزرگوں کے نام و نشان کا گلا گھونٹا ہے۔ داڑھی کے بال اس لیے چھوڑ رہے ہیں کہ دشمن کرسٹان کی پھبتی کہیں گے۔ ورنہ چار ابرو تک کا صفایا کر دیتے۔"

عارف کی آنکھیں خلا میں کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں لیکن وہ اپنے جگر میں چبھن محسوس کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ پتلا اور ہاتھ پاؤں دبلے

ہو گئے تھے اور رنگ پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ عارضے کے علاج کے متعلق سوچنے لگا۔

پھر سپاہی بچّے میاں ذوقؔ کے شاگرد، نسخہ نویس حکیم آغا جان عیش کے ولی نعمت اور مرزا قتیلؔ کی فارسی دانی کے معترف اور دلّی کے بادشاہ بہادر شاہ ثانی کا فرمان عالی نصیب ہوا جسے پڑھ کر ایک آنکھ رو دی، دوسری ہنس دی۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ میرزا اسداللہ خاں غالب خلعت سے سرفراز ہوئے۔ چھے سو روپئے سالانہ تنخواہ منظور ہوئی۔ خاندان تیموری کی خدمت تاریخ نویسی تفویض کی گئی۔ یعنی غالب کا قلم ہاتھ سے چھین کر کان پر رکھ دیا گیا کہ بڑا شاعر بنا پھرتا تھا لے محرّری کر۔ صرف محرّری کہ تاریخی مواد وہ مولوی متصدی جمع کریں گے جن کو اگر غالب کے علم و فضل کی ہوا لگ جائے تو قوم کی عاقبت نہ سہی دنیا ضرور سنور جائے۔ تاریخ کو بین السطور میں پڑھنے والے عالم زبان منشیوں اور متصدیوں کو ترجیح دی گئی جو تاریخ کو طوطے کی طرح رٹنے کے قائل تھے۔ وہ دیر تک فرمان لئے بیٹھا رہا۔ بار بار پڑھتا رہا جب لفظ دھندلانے لگے تو دل نے آواز دی۔

"میاں غالب جس باسٹھ انچ کے گز سے تم تیس دن اور تیس راتوں کے صحرا کو ناپا کرتے تھے اس میں پچاس انچ اور جوڑ دیئے گئے۔ شکر کرو کہ پوری نہیں تو آدھی شراب کا انتظام ضرور ہو گیا۔ رہی ملک الشعرائی تو ملک الشعراء، وہ نہیں ہوتے جن کو بادشاہ ملک الشعراء بناتے ہیں۔

ملک الشعراء وہ ہوتے ہیں جن کا کلام ملک الکلام ہوتا ہے۔ کل کے کتنے ملک الشعراء آج طاقِ نسیاں ہو گئے لیکن حافظ رہا اور خیام رہا ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ابھی بادشاہ کی تنخواہ سے آفتابِ جام طلوع بھی نہ ہوا تھا کہ عارف ڈوب گیا۔ امراؤ بیگم کا بھانجا مر گیا۔ وہ مر گیا جس کے وجود میں اس نے پدرانہ جذبات کے اظہار کا وسیلہ تلاش کیا تھا۔ وہ لکڑی ٹوٹ گئی جسے عصائے پیری کا لقب ملنے والا تھا۔ امراؤ بیگم کو دیکھ کر محسوس ہوا جیسے عارف نہیں مرا خود ان کی کوکھ سے جنے کئی بچے جوان ہو کر ایک ساتھ مر گئے۔ ایک گھڑی میں مر گئے۔ عارف کی بیوہ کی آنکھیں دیکھیں تو جیسے اپنی بینائی جاتی رہی۔ عارف کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے چہرے دیکھے تو اپنے غم کھلونے معلوم ہونے لگے۔ یہ خدائے رحیم و کریم کے صحیفۂ انصاف کی کون سی آیت ہے جو ان معصوموں پر نازل کی گئی۔ ان شیر خواروں کے کون سے گناہ ہیں جن کی یہ سزا تجویز ہوئی۔ پہلی بار خدا کی خدائی اور بادشاہ کی بادشاہی میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوا کہ انصاف نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے۔

ابھی بہادر شاہ کی تخت نشینی کی سلامی کی توپوں کے فلیتے دھواں دے رہے تھے کہ قحط مبارکباد دینے آ گیا اور قحط بھی ایسا کہ الاماں الحفیظ

مٹھی بھر آٹے کے عوض بیٹیاں بکنے لگیں۔ بازاروں میں اجناس کی بوریوں کے بھاؤ اولاد کی ڈھیریاں طے کرنے لگیں۔ اس نے گھر کے دروازے بند کر لئے کہ باہر نکلنے کے خیال سے دل بیٹھنے لگتا۔

زندگی دن رات کی سفید و سیاہ چکی میں پس رہی تھی کہ اچانک چھوٹی چھوٹی چپاتیاں نمودار ہونے لگیں کہ آسمان سے بربادی کی اڑن طشتریاں اترنے لگیں۔ بڑے بڑے عالم فاضل جو ٹونے ٹوٹکے کے قابل نہ تھے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان خرافات کی تاویلیں کرنے لگے کہ جنگ پلاسی کو سو سال پورے ہو چکے اور اب انگریز کی روانگی کا بگل بجنے والا ہے۔ بڑے بڑے مدبر آسمان پر ڈوبتے سورج کی سرخی کو زمین پر بہنے والے خون کے دریا کی تمہید کہنے لگے۔ فقیروں اور ملنگوں کی بے سروپا باتوں میں سنہرے اور آزاد اور تابناک مستقبل کی سازش ڈھونڈھنے لگے۔ انگریزی بوٹوں سے کچلے ہوئے افغانستان سے فاتح لشکروں کے اترنے کا انتظار کرنے لگے۔ بے دست و پا ایران کے خفیہ شاہی ایلچیوں سے فرضی ملاقاتوں کے افسانے سنائے جانے لگے۔ لکھنؤ کی معزول فوجوں کے افسر اور پیشوا کے برخاست لشکروں کے سردار افواہوں کی پوری میگزین لے کر داخل ہو گئے۔ مندروں میں پیشوائی کے ہون ہونے لگے اور مسجدوں میں نماز انتظار پڑھی جانے لگی۔ مغرب کے آسمان پر غبار کا ایک دھبہ نظر آجاتا تو خبردار سوار ہو کر ان گھوڑوں کی خبر لینے اڑ جاتے جن کے سموں کی دھول سے یہ آندھی

اٹھی تھی۔ گزک کی دوکانوں سے قلعے کے محلوں تک، طوائف کے کوٹھوں سے پیروں کی درگاہوں تک ایک کارخانہ تھا جہاں خبریں ڈھالی جارہی تھیں۔ بے خبروں کی بے عملی کے لئے ہر شب شبِ خبر تھی اور روز روزِ ندا۔

وہ .... جن کے اشاروں پر بھاپ کا ایک دیو ہزاروں جیپوؤں پر مشتمل جہازوں سے سمندر کا سینہ چیر ڈالتا۔ جن کی بارودی سرنگیں آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کے دھوئیں اڑا دیتیں۔ جنھوں نے زمین پر لوہے کی سڑکیں بچھا کر وہ ہولناک اگن جنڈول دوڑا دیئے جن کے سامنے ہزاروں ہاتھی گھوڑے مکھی مچھر ہوگئے۔ ہوا کے دوش پر پیام و سلام کے وہ سلسلے قایم کر دیئے کہ چراغ الہ دین کے افسانے ہیچ ہوگئے۔ اپنی فہم و فراست پر بھروسا کئے اپنے معاملات میں مبتلا تھے کہ میرٹھ کی چھاؤنی سے وہ آندھی اٹھی کہ دلی بے چراغ ہوگئی۔

وہ روزِ پیر تھا کہ فلکِ بے پیر کی کمان سے نکلا ہوا تیر .... جو اٹک کے ساحلوں سے موسیٰ کے کناروں تک پھیلی ہوئی گنگا جمنی تہذیب کے کلیجے میں ترازو ہوگیا۔ معمول کے مطابق وہ لال پردے پر سلامی دے کر آگے بڑھا۔ بادشاہ دیوانِ خاص میں چاندی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ سنہرے ستونوں پر سرخ زربفت کا نمگیرہ کھڑا تھا۔ آداب گاہ پر راقم الدولہ ظہیر دہلوی سلام کر رہے تھے کہ ایک طرف سے امیر اور وزیر اور حکیم احسن اللہ خاں آیا۔ جو نہ امیر تھا نہ وزیر تھا نہ حکیم تھا۔ ایک منافق تھا، ایک

مخبر تھا، ایک جاسوس تھا۔ حد ادب سے گذر کر قریب ہوگیا اور تقریباً بادشاہ کے کان پر منھ رکھ دیا اور اب دریا کی طرف سے آنے والی آوازوں کا حجم بڑھنے لگا تھا اور الفاظ سمجھ میں آنے لگے تھے۔ تیموری آداب کے خلاف بادشاہ کسی تمہید کے بغیر تخت سے اتر پڑا۔ بیاسی برس کی عمر میں بھی اس کی چال تیز تھی۔ جھروکے پر پہنچتے ہی نیچے سے اٹھتی ہوئی آوازوں کا زور تھم گیا۔ دیر کے بعد بادشاہ کی آواز بلند ہوئی جس میں خالی دیغ کی جھنکار تھی۔

"سنو.... بادشاہت سو برس پہلے ہمارے گھر سے رخصت ہو چکی۔ ہم فقیر ہیں۔ اپنی اولاد لئے تکیے میں بیٹھے ہیں۔ خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دیں۔ فوج نہیں کہ تمھاری مدد کریں۔ ملک نہیں کہ تم کو تحصیل کے لئے نوکر رکھیں۔ ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ انگریزوں سے تمھاری صلح کرا دیں۔"

اسے حیرت ہوئی کہ یہ غبی شخص کتنی صحیح بات کہہ رہا ہے لیکن وہاں ہزاروں آوازوں کے تار میں دو فقرے بندھے تھے جو ایک دیو پیکر جھنجھنے کی طرح بج رہے تھے۔

"آپ مہابلی ہیں ظلِ الٰہی ہیں، دین دنیا کے بادشاہ ہیں۔"

"دہائی ہے بادشاہ سلامت کی۔ دھرم کی جنگ میں مدد کے بھکاری ہیں۔"

فرنگی مردہ باد اور بادشاہ زندہ باد کے نعروں سے قلعہ ہل رہا تھا کہ قلعہ دار کپتان ڈوگلس الٹی سیدھی وردی پہنے بغل میں ٹوپی دبائے دوڑتا

ہوا آیا اور دوسرے بڑے جاسوس رجب علی کے ساتھ بادشاہ کے پاس جھرو کے میں چلا گیا۔ پر جوش آوازوں کے تبادلے کے بعد بندوق کا ایک فیر ہوا اور ڈوگلس دونوں جاسوسوں کے ساتھ دربار عام کی طرف بھاگتا نظر آیا۔ ساتھ ہی چوبدار نے دربار دربار برخاست ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن دربار اسی طرح کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ پھر اس نے خالی تخت کو سلام کیا اور الٹے پیروں اس مقام تک آیا جہاں نعلین خالی کئے جاتے تھے۔ لال پردے پر تسلیم کے لئے جھکا تو دل نے آواز دی کہاں جاتے ہو؟ تاریخ کا پٹارہ کھل چکا۔ یہ وہ دن ہے جسے پڑھنے کے لئے مورخ صدیوں تک کتابوں کے کیڑے بنے رہیں گے۔ وہ دیوان عام کی شمالی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ ایک حبشی سے مانگ کر پانی کا کٹورہ پی رہا تھا کہ نوبت خانے پر ہنگامہ ہوا۔ بھگدڑ سی مچ گئی۔ سلاطین ننگی تلواریں لئے اپنی ڈیوڑھیوں سے نکل پڑے لیکن کسی کے قدم کسی سمت پر نہ تھے کہ لاہوری دروازے پر ڈوگلس صاحب مارے گئے۔ کٹورہ حبشی کو دے کر وہ تیزی سے چلا۔ نوبت خانے کے قریب پہنچا تھا کہ شور مچ گیا۔

"لاہوری دروازے پر سارے انگریز قتل کر دیئے گئے"

کچھ شہزادے اور سلاطین لاہوری دروازے کی طرف دوڑے اور کچھ لال پردے کی طرف بھاگے۔ ساتھ ہی قلعے کے دونوں دروازوں سے بندوقیں سر ہونے لگیں۔ وہ چوبیں مسجد کے نیچے تھا کہ لاہوری دروازے سے تلنگوں کا ہجوم "دین دین" کے نعرے لگاتا گھس آیا۔ اکثر پوری وردیاں

پہنے تھے اور بیشتر بے میل لباسوں پر ڈاکوؤں کی طرح ڈھاٹے باندھے تھے۔ لال پردے پر محافظوں سے ادب آداب پر تکرار ہوئی اور وہ زور کر کے دیوان خاص کے سامنے پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے قلعے میں ان کے دل بادل امنڈنے لگے۔ پھر وہ اپنے افسروں کے ساتھ ہاتھ باندھ کر اور ہاتھ جوڑ کر تخت کے سامنے جھک گئے۔ سیڑھیوں کو چوم لیا ستونوں پر سر رکھ دیئے اور آنسوؤں سے پردے بھگو دیئے۔ افسروں نے تلواریں نکال نکال کر تخت کے سامنے ڈال دیں۔ پھر ان میں سے کسی کی آواز آئی۔

"مہابلی یہ سپاہی ہیں۔ دربار کے آداب نہیں جانتے لیکن کلکتہ سے کابل تک فرنگیوں نے انھیں کے ہاتھوں پر فتح پائی ہے ظلّ الٰہی ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ یہ سارا ملک فتح کر کے آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ سارے خزانے جیت کر نذر میں گذار دیں گے۔"

بادشاہ خاموش رہا تو اس نے آداب گاہ پر سر رکھ دیا۔ بادشاہ کا اس کے سر پر ہاتھ رکھنا تھا کہ تہلکہ مچ گیا۔ بندوقوں اور پستولوں کے فیر ہونے لگے۔ مہابلی زندہ باد کے نعروں سے قلعے کی دیواریں ہلنے لگیں اور جیسے کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر لاہوری دروازے سے گذار دیا۔ دروازے کے گھونگھٹ پر تلنگے ایچی بنے کھڑے تھے۔ خندق کی دانتی پر ڈوگلس صاحب خون میں نہائے ڈھیر تھے اور لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ چاندنی چوک کی سڑک کے سامنے خیال آیا کہ ہوا دار دہلی دروازے پر کھڑا سوکھ رہا ہے۔ وہ دہلی دروازے کی طرف مڑا۔ تھوڑی دور پر تماش بینوں کی کمان

کے سامنے صاحب بہادر کی لاش پڑی تھی۔ کیا یہ وہی شخص ہے جس کے خوف سے قلعے کے دروازے کانپتے تھے۔ دہلی دروازے کے سامنے دو سوار جو سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے اونٹوں پر سبز بالاپوش ڈالے تھے، سامنے کھڑی بھیڑ کو دیکھ کر گرجے۔

"اے لوگو مذہب کا ڈنکا بج گیا۔"

آواز کی آنچ سے کان جل گئے۔ پہلی بار القا ہوا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ بہت کچھ ہو رہنے کا محض ایک دیباچہ ہے۔ شاہجہانی مسجد کے سامنے سڑک بند تھی۔ آدمیوں کے ٹھٹھ فصیل کی طرح کھڑے تھے۔ اچانک دین دین کے نعرے لگنے لگے۔ وہ اپنے ہوادار پر کھڑا ہوگیا۔ دو سوار اپنی رکابوں میں بندھی رسیوں میں کرنل رپلے صاحب بہادر کی لاش گھسیٹتے گذر گئے۔ ہجوم تالیاں بجا رہا تھا۔ آگے بڑھا ہی تھا کہ اتنے زور کا دھماکہ ہوا جیسے سیکڑوں بجلیاں ایک ساتھ کڑک گئی ہوں۔ ہزاروں مکان ہل گئے، چھتیں گئیں، گر گئیں۔ دوکانوں کے تختوں پر بیٹھے ہوئے آدمی لڑھک گئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے خبر آگئی کہ باغیوں نے دلّی کی پوری انگریزی میگزین اڑا دی۔
پگھلی ہوئی آگ کا ایک پیالہ پیٹ میں پہنچا تو اسداللہ خاں آکر سامنے کھڑا ہوگیا۔

"غالب کی تاریخی بصیرت کیا کہتی ہے؟"

"جواب کے لئے تاریخی بصیرت کی ضرورت نہیں، مدرسے کے مولویوں کا علم کافی ہے۔"

"یعنی؟"

"بیاسی سال کا بڈھا نہ شیر دکن ٹیپو سلطان ہو سکتا ہے نہ شیر بنگال سراج الدولہ، نہ مہاراجہ رنجیت ہو سکتا ہے نہ گھاگ پیشوا۔ پھر ان کا جو حشر ہوا انھیں جاننے کے لیے کسی تاریخی بصیرت کی ضرورت ہے؟"

"تمھارا خیال ہے کہ یہ سب کچھ ....؟"

"افرنگ کے مداری کا تماشہ ہے قلعہ خالی کرا لینے کا بہانہ ہے مغلوں کو قطب میں قید کر دینے کا شاخسانہ ہے۔"

اسد اللہ خاں مسکرائے۔

"بڑے بڑے انگریزوں کی یہ کتے کی موت؟"

زندہ قومیں اپنے عروج کے لیے افراد کی لاشوں سے زینہ بنا لیتی ہیں۔"

اس بار اسد اللہ ہنس دیے کہ وہ غالب پر ہنسنے کی عادت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

وہ دیر سے سویا دیر سے اٹھا۔ نہا دھو کر دسترخوان پر بیٹھا تھا کہ شاہی چوبدار آگیا اور اس طرح آیا جیسے اکبر و جہانگیر کے چوبدار آتے ہوں گے کہ پوری گلی سواروں سے چھلکنے لگی۔ بڑے تزک و احتشام سے فرمان سنایا۔

"ظلِ الٰہی کا فرمان ہے کہ مضروب ہونے والے سکے پر نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا شعر کندہ کیا جائے۔"

وہ سن ہو کر رہ گیا جیسے داستانوں کے کردار طلسم سے پتھر ہو جاتے

پھر ایک خیال کے آتے ہی زندہ ہوگیا۔ بادشاہ نے اسداللہ خاں کو ملازم رکھا ہے۔ تاریخ نگاری کی خدمت سپرد ہوئی ہے۔ شاعر غالب کو اس ملازمت سے کیا تعلق۔ نہ شاعر کا مورخ ہونا ضروری اور نہ مورخ کے لئے شاعری شرط۔ اپنے جواب کی ندرت پر ہنس دیا۔

دریا گنج سے قلعے تک سواریاں ڈھیر تھیں۔ انگریزوں کے مکانوں کے لٹنے کی کہانیوں کی جگالی ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ بادشاہ کے نام پر ٹھنڈے شربت کی سبیلیں لگی تھیں۔ کتنے ہی حلوائیوں نے ترنگ میں آکر اپنی دوکانیں لٹا دی تھیں۔ کتنے ہی خوش باشوں نے دوکانیں خرید کر تقسیم کر دیں۔ کیسے کیسے سوکھے چہرے شاداب ہو گئے تھے اور متانت جو تبسم تک سے بے نیاز رہتی قہقہے لگا رہی تھی۔ قلعۂ مبارک کے دہلی دروازے پر مسلح ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کے رسالے جمع تھے۔ پیادوں کی پلٹنیں کھڑی تھیں، دمدموں پر توپیں لگی تھیں، دروازے کے گھونگھٹ پر ہتھیاروں کا پردہ کھڑا تھا۔ نام و نسب کی پوچھ گچھ کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اندرونی دروازے سے نقار خانے تک مردوں کے غول اور حبشیوں کے دستے کمر کسے، دستاریں پہنے ہاتھوں میں بڑی بڑی سرخ لکڑیاں لئے ادب آداب کی تعلیم دیتے پھر رہے تھے۔ قدم قدم پر بھری ہوئی بندوقیں اور ننگی تلواریں پہرہ دے رہی تھیں۔ پرانے کی جگہ نیا لال پردہ لگا تھا۔ پہلی بار پیادوں کے ساتھ سواروں کو کھڑے دیکھا۔ شہزادے اور سلاطین سچے کام کے پرانے دھراؤ لباسوں پر زیور دل

کی جگہ ہتھیار پہنے اجنبی اجنبی لگ رہے تھے۔ کتنے ہی منچلے سڑی گرمی کے باوجود سمور اور جامے وار لادے تھے اور کمر میں دوشالے باندھے تھے۔ پگڑیوں میں پتھروں اور موتیوں کے سرپیچ بندھے تھے عقاب وطاؤس کے پروں کی کلغیاں لگی تھیں۔ زرتار طرّے کھڑے تھے۔ پانوں زمین پر نہ پڑتے تھے کہ آنکھوں نے تخت طاؤس دیکھ لیا تھا۔ محمود غزنوی کا جانشیں نادر شاہ درّانی جب تخت طاؤس لوٹ لے گیا اور بوڑھے شہنشاہ نے چاندی کے تخت پر دربار کیا تو آنسوؤں سے داڑھی بھیگ گئی۔ نمک خواروں نے صنّاعوں کی پوری ایک فوج بھرتی کرلی۔ اور چند ہی دنوں میں لکڑی کا تخت طاؤس بناکر بچھا دیا۔ شہنشاہ جس نے تخت طاؤس کی آب وتاب میں آنکھ کھولی تھی نقل کو دیکھ کر دنگ رہ گیا طاؤس کے پروں کی تاب سے موتیوں کی آب تک نے اس کی نگاہ سے خراج وصول کرلیا۔ جب اس کے جانشینوں کے دربار اس نقلی تخت کو بھی سہنے کے قابل نہ رہے تو اس پر غلاف ڈال کر دیوان عام کے تہ خانے میں بند کر دیا۔ ۱۱ مئی کا سورج غروب ہونے سے قبل تہ خانہ کھولا گیا تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں کہ تخت اسی طرح جھمجھما رہا تھا۔ دلّی کے صنّاعوں نے کہ صنّاعی جن کے گھر کی لونڈی رہی، راتوں رات شطرہ تخت کو شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ دیوان خاص کے سامنے شاہجہاں کے مشہور عالم دل بادل کی طرح مسجد جامع کا شامیانہ کھڑا تھا۔ چپہ چپہ آدمیوں سے ابل رہا تھا۔ بہادر شاہ ثانی مغلوں کا روایتی چوگوشیہ

تاج پہنے زیوروں میں ڈھکا ہوا تخت طاؤس پر جلوس آرا تھا۔ گلال بار پر شہنشاہ کا بیٹا مرزا مغل مجرا کر رہا تھا۔ تخت کی سیڑھیوں کے پاس جاسوسوں کا بادشاہ حکیم احسن اللہ خاں وزیر اعظم بنا کھڑا تھا۔ بادشاہ تخت سے اترا۔ ایک خواص کے طشت سے مرصع تلوار اٹھا کر مرزا مغل کی کمر میں باندھ دی اور اعلان کیا۔

"میرزا ظہیر الدین محمد عرف میرزا مغل کو تمام افواج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔"

یہ سنتے ہی برقندازوں کے ایک دستے نے ہوا میں فیر کئے۔ ساتھ ہی قلعے کے دونوں دروازوں کی توپوں نے سلامی دی۔ میرزا ابو بکر کو شاہی سواروں کی افسری اور میرزا خضر سلطان کو پانی پت پلٹن کی کرنیلی عطا کی گئی۔ ان شہزادوں کو جنھوں نے کبھی شکار کے لئے بھی بندوق نہ بھری تھی انگریزوں کے توپ خانے سے جو جھنے والے لشکروں کا سالار اعظم اور سالار اوّل بنا دیا گیا۔ خدا کی خدائی اور بادشاہ کی بادشاہی میں کون دخل دے سکتا ہے؟

ایسی بہت سی خرافات کے بعد وزیر اعظم نے ان گنت دوکانوں اور کتنے ہی مکانوں کے لٹنے اور پھنکنے کی اطلاع دی اور باغی افسروں نے یک زبان ہو کر بادشاہ سے سوار ہونے کی گذارش کی۔ چشم زدن میں بادشاہ کا مشہور ہاتھی مولا بخش چاندی کی عماری پر سونے کا چھتر لگا طلا کار اطلس کا بالاپوش پہن کر حاضر ہو گیا۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی سونڈ اٹھا کر ماتھے پر رکھی اور چنگھ

کر سلام کیا۔ خواصوں کے افسر نے چاندی کی سیڑھی لگا دی اور شہنشاہ ہند زندہ باد، فرنگی حکومت مردہ باد کے نعروں کی تکرار میں بادشاہ سوار ہو گیا۔ میرزا فخرو مرحوم کا بیٹا خواصی میں بٹھایا گیا۔ لاہوری دروازے سے نکلتے ہی ہزاروں لاکھوں انسانوں نے اس کی بادشاہی پر جانیں نثار کر دینے کا اعلان کیا۔ چاندنی چوک میں بہتی ہوئی نہر کے اُلٹی طرف سڑک پر گھوڑ سواروں کی دوہری قطار چل رہی تھی جن میں سے اکثر وردیاں پہنے تھے اور شانوں پر سبز یا زعفرانی چادریں ڈالے تھے۔ سیکڑوں سواروں کے پیچھے بادشاہ کا ہاتھی تھا اور اس کے پیچھے حدِ نگاہ تک سوار ہی سوار چلے آ رہے تھے اور نہر کے سیدھی طرف دِلّی والوں کا ہجوم تھا۔ دوکانوں اور عمارتوں میں اور ان کی چھتوں پر اور درختوں پر اور ہر اس جگہ جہاں کوئی کھڑا ہو سکتا تھا آدمیوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ بادشاہ چشم و ابرو کے اشاروں سے سلام اور سلامیاں قبول کر رہا تھا۔ جلی لٹی دوکانوں کے اردگرد کی بند دوکانیں بادشاہ کا ہاتھی دیکھ کر کھلنے لگیں۔ جلوس فتحپوری مسجد پر مڑ کر نہر کی دوسری طرف آ گیا۔ بادشاہ کی سواری مندر کے متوازی آ گئی لیکن جلوس کا آخری حصہ مندر کے پیچھے سڑک پر چل رہا تھا۔ بادشاہ کا ہاتھی قلعے کے دہلی دروازے کی طرف مڑ گیا کہ آدمیوں کا سمندر درشن کا منتظر تھا۔ وہ کناری بازار کے راستے پر ہو لیا۔ تھوڑی دور پر ایک انگریز کی لاش پڑی تھی جیسے انگریزی کا حرف "وائی" بنا ہو۔ کسی مسخرے نے اس کے منہ میں ایک بسکٹ بھی پھنسا دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

لال محل کے پھاٹک پر فرخ آباد کے پیادے بندوقیں بھرے پہرہ دے رہے تھے۔ کھڑکی تک بند تھی۔ دیر کے بعد ایک سپاہی نے پٹ کھول کر اسے دیکھا اور اندر کر لیا۔ چغتائی بیگم کا سامنا ہوتے ہی شکوہ و شکایت کو بھلانے کے لئے اس نے شعر پڑھا ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

بیگم نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس کا کفتان لے کر لونڈی کو پنکھا کھینچنے کا حکم دیا۔

"بیگم پہلے ایک کٹورہ پانی پلوائے"۔

"میرزا صاحب .... آپ ایک روزہ بھی نہیں رکھتے؟

"رکھتے ہیں لیکن چونکہ غالی سنی ہیں اس لئے چار گھڑی دن رہے کھول لیتے ہیں"۔

"بیگم کولھوں پر ہاتھ رکھے اسے گھورتی رہیں"۔

"آپ کی عمر ساٹھ برس تو ہو گی"۔

" اصل میں بیگم ایسا ہے کہ میں نے انکساری میں سامنے کے دو دانت نکلوا دیئے تھے۔ دشمنوں نے اڑادی کہ گر گئے۔ خیر۔ آپ بھی کہیئے۔ اس وجہ سے آپ کو مغالطہ ہوا۔ اور یوں بھی اگر ہے بھی تو مرد ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے ... ورنہ سچ پوچھئے تو میں کیا میری عمر کیا"۔

جی ہاں .. عورت بیچاری جیسی کیسی ہوتی ہے ... اچھا پانی پی کر

ذرا سستا لیجیے میں افطار کا سامان دیکھتی ہوں۔"

"ضرور دیکھیے۔ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ میں افطار کے وقت صرف پینے کا قائل ہوں اور روزے پر روزہ رکھ رہا ہوں ... جی ہاں۔"

کنیز گردن جھکائے مسکرا رہی تھی اور پنکھا کھینچ رہی تھی۔ اس نے گاؤ تکیے سے پشت لگا کر اخبار اٹھا لیا۔

افطار کی توپ چلی تو اس نے ٹوپی سر پر رکھ کر ایک کھجور منہ میں ڈال لی اور شربت کا گلاس اٹھا لیا۔ نماز کے بعد بیگم دسترخوان پر بیٹھیں۔

"آج کل اللہ میاں سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"یک طرفہ۔ ہم اپنی طرف سے نبھائے جاتے ہیں۔ ان کی طرف سے وہی سرد مہری ہے۔ شراب ہے تو گلاب نہیں، گلاب ہے تو بادام نہیں۔"

"جب سے ہنگامہ ہوا ہے آپ بے طرح یاد آئے جا رہے تھے ... سنا ہے ہزاروں انگریز مار ڈالے گئے۔ سیکڑوں مکانات جل گئے، دکانیں پھنک گئیں۔ ساری رات محلّے میں کہرام رہا۔ فرنگیوں کو ڈھونڈنے کے بہانے گھروں میں گھس آتے ہیں جو ہاتھ لگتا ہے لوٹ لے جاتے ہیں۔ یہ جو برابر میں منشی اجن صاحب ہیں، کلاں صاحب بہادر کی کچہری میں میر منشی! ان کے گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ وہاں بادشاہی کا اعلان ہو رہا ہے یہاں آبرو پر بنی جا رہی ہے۔ مغل جان آئی تھیں آج صبح۔ کہہ رہی تھیں پورا دریبہ اجاڑ دیا ہے۔ جتنی نامی گرامی ناچنے گانے والیاں تھیں

قلعے میں اٹھوالی گئیں۔ اچھی صورت والیوں کے یہاں پوربیوں کے پڑاؤ پڑے ہیں۔ سن سن کر دل ہول رہا ہے۔ سازندے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ رات میں صرافے میں جو دوکانیں لوٹتے ہیں دن میں انھیں کے کاریگروں سے سلاخیں، بنواتے ہیں اور کمریں باندھ لیتے ہیں۔ شہزادوں سلاطینوں کی بن آئی ہے۔ دن میں لڑائی کے نام پر روپیہ وصول کرتے ہیں اور رات میں کسبیوں سے پانوں دلواتے ہیں.... اللہ میں تو چرخ ہوا وٹے جا رہی ہوں اور آپ چپ کا روزہ رکھے بیٹھے ہیں۔"

"جی اگر آپ نے کہا مان لیا ہوتا تو آج آپ حضرت محل کے بجائے مریم زمانی بیگم ہوتیں اور ہم بھی سو پچاس سوار رکاب میں لئے دتی کی سڑکوں پر اودھم مچاتے کر رہے ہوتے۔"

"شہر میں شہرہ ہے کہ آپ سکّہ لکھ رہے ہیں۔"

"شہرہ تو ہے لیکن بھنگی کے ہاتھ سے پھانسی پانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"اے خدا نہ کرے میرزا صاحب شیطان کے کان بہرے۔"

"جی ہاں بیگم .... یہ ہوائیاں ہیں چھوٹ رہی ہیں۔ دتی ہڑبونگ بے بچ رہا ہے۔ ایک ذرا انگریز کو سنبھلنے دیجئے پھر دیکھیے گا تماشہ۔"

"آپ پہلے آدمی ہیں جس کی زبان سے یہ بات سن رہی ہوں ورنہ سارا شہر تو کچھ اور ہی الاپ رہا ہے۔"

"جی ہاں .... شہر میں غالب بھی ایک ہی ہے۔"

رات کی گرہیں کھل رہی تھیں اور اشعار بیاض میں اتر رہے تھے۔
حکیم آغا جان عیش آ گئے اور بیٹھتے ہی بیٹھتے دغ گئے۔
"ظلِ الٰہی آپ کے سکّے کا انتظار فرما رہے ہیں اور آپ۔"
"حکیم صاحب خدا گواہ ہے کہ تین دن رات سے فکر شعر میں مبتلا ہوں۔ دربار سے منہ چرائے بیٹھا ہوں لیکن شعر نہیں ہوتا، جو ہوا ہے اس پر دل نہیں جمتا۔ آپ بھی سن دیکھئے ؎

بہ زر زد سکۂ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شہ غازی

"سبحان اللہ کیا برجستہ اور برمحل شعر فرما دیا ہے اور ..."
"تو آپ کی نذر ہے حکیم صاحب۔"
"لاحول ولاقوۃ ... کیا فرما رہے ہیں آپ۔"
"سچ کہہ رہا ہوں حکیم صاحب۔ اگر آپ کی شان کے خلاف نہ ہو تو فقیر کا تحفہ جان کر قبول کر لیجئے۔"
"خیر یہ تو ممکن نہیں لیکن شعر بارگاہ تک پہنچا دوں گا مگر ایک شرط ہے۔"
"سر آنکھوں پر۔"
"آج دربار سے محروم رہئے ورنہ پیچ پڑ جائے گا۔"
"میں حاضری کے قابل ہی نہیں۔ کچھ سوئے مزاج ہے ورنہ مزہ تو آج ہی کل دربار اٹھانے کا تھا۔"
"کوئی خاص تکلیف ؟"

"نہیں بادشاہ کی سرخ روئی کا فکر کھائے جاتا ہے ۔۔۔ ذرا بے خواب بھی رہا ہوں ۔"

" وہ تو سب خدا کے فضل سے فتح سمجھئے ۔شہنشاہی کی زیر نگرانی ایک عدالت بن گئی ہے ۔ پانچ رکن مسلمان ہیں اور پانچ ہندو ۔"

" ہندو ممبر کون کون ہیں ؟"

"جنرل گوری شنکر، صوبے دار بہادر جیو رام، بیت رام شیو رام اور بینی رام ۔ جلسے ہو رہے، فیصلے کئے جا رہے ہیں ۔ کل تراویح کے بعد جو اجلاس ہوا تو سحری کا وقت ہو گیا ۔"

"کل کیا کوئی خاص بات تھی ؟"

"آپ نے نہیں سنا ؟"

" نہیں ۔۔۔ خیریت ہے ؟"

" راجہ کشن گڈھ کی کوٹھی میں بہت سے انگریز چھپے ہوئے تھے ۔منشی مہرالاسلام نے مخبری کر دی ۔ بس قیامت آگئی ۔سیکڑوں سوار توپیں لے کر پہنچ گئے اور ایک ایک کو کاٹ کر پھینک دیا ۔ ابھی یہ ہنگامہ برپا تھا کہ چودھری چمن نے آگ لگا دی اور قلعے میں جو انگریز عورتیں اور بچے خود بادشاہ کی حفاظت میں تھے انھیں بھی چھین کر ذبح کر دیا ۔"

" منشی مہرالاسلام کو تو خیر خوب جانتا ہوں لیکن یہ چودھری چمن کیا بلا ہے ؟"

" چودھری چمن کو نہیں جانتے آپ ۔ قلعے میں لال پردے کے پاس

خواہی نخواہی منڈلایا کرتا ہے۔"

"کچھ حلیہ بتلائیے حکیم صاحب۔"

"حلیہ ایسا ہے کہ بادشاہی حلیہ نویس قلم توڑ کر بیٹھ رہیں۔"

"یعنی!"

"قد لمبا نہ چھوٹا۔ رنگ اجلا نہ میلا۔ انتہا یہ کہ داڑھی بھی داڑھیوں کی کسی قسم میں شامل نہیں۔ بس داڑھی "تل چاولی" ہونے لگی ہے۔ آنکھیں پتھر کی بنی ہوئی، چہرہ لوہے کا ڈھلا ہوا۔ نہ خوشی میں ہنستا ہے نہ غمی میں روتا ہے یعنی قدرت نے اپنے ہاتھ سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ شکار پور کے ایک گانوں کی عنایت ہے جو دتی پر نازل ہے۔ گانوں میں فرنگیوں کی "حاضری" کے لئے سور پالتا ہے اور شہر میں لال پردے کی مکھیاں اڑاتا ہے۔ غزل جوڑتا ہے، داستان گانٹھتا ہے اور انشا ٹانکتا ہے۔ چھاؤنی میں گوروں کو اردو پڑھاتا ہے۔ ان کے گلاسوں کی بچی کھچی شراب جمع کر کے دام بھی کھرے کرتا ہے اور غریب غربا کو بلا کر مشاعروں کی صدارت بھی جھٹک لیتا ہے۔ انگریزی کے ہاتھ پیر توڑ لیتا ہے تو زبان انگریزی ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلوں پر کاغذ سیاہ اور اپنا منھ کالا کرتا ہے۔ پیروں فقیروں کی درگاہوں پر جب بھوت چڑیلوں کی ماری عورتیں آتی ہیں اپنے سفید آقاؤں کو لے جا کر نظارے کراتا ہے اور جھولیاں بھر بھر انعام پاتا ہے۔ سنا ہے کسی کرشان سے بیاہ رچایا تھا جب بالوں میں سفیدی پھوٹنے لگی تو وہ لات مار کر کسی اور کے گھر بیٹھ

رہی۔ اب بچے بھی پالتا ہے۔"

"آپ نے بچے پالنے کا ذکر یوں کیا کہ میں سمجھا اب آپ فرمائیں گے دودھ بھی پلاتا ہے۔"

"واللہ میرزا صاحب اگر کہہ بھی دیتا تو غلط نہ ہوتا کہ ایسے مرد مرد نہیں ہوتے ہیجڑے ہوتے ہیں۔ اور ہیجڑوں اور عورتوں میں کچھ ایسا فرق بھی نہیں ہوتا۔ اچھا اب اجازت دیجئے دھوپ تیز ہونے لگی ہے۔"

"یوں بھی حکیم صاحب خاطر کرنے کو گھر میں کیا ہوتا ہے لیکن آپ روزے سے ہیں۔"

"سبحان اللہ میرزا صاحب۔ شرمندہ کرنے کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے۔ اور یہ روزے سے ہیں کی بلاغت کا جواب نہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اس نے پالکی تک ساتھ دیا۔

عید کی چاند رات کو داروغۂ چاندنی خانہ نے قلعۂ مبارک روشن کیا تھا کہ رات کی گود میں دن اٹھا کر ڈال دیا تھا۔ بہادر شاہ کو بہت دنوں بعد اس نے اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر جیسے دس بیس سال کم ہو گئی تھی۔ بادشاہ تسبیح خانے میں جلوس کئے ہوئے تھا کہ شاہجہانی مسجد کے امام نے عید کے چاند کی مبارکباد پیش کی۔ ساتھ ہی دونوں دروازوں سے توپیں سر ہونے لگیں۔ میرزا مغل کمانڈران چیف نے پہلا مجرا پیش کیا۔ شہزادوں اور امیروں اور وزیروں کے بعد اس کا نمبر آیا۔ مجرا قبول کر کے آنکھ سے ٹھہرنے کا اشارہ ہوا۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑا

ہوگیا۔ کھڑا رہا کہ خاصۂ کلاں و خرد، آبدار خانہ، دوا خانہ، کبوتر خانہ، جواہر خانہ، توشہ خانہ، فیل خانہ، شتر خانہ، بگھی خانہ اور کارخانہ جلوس و ماہی ومراتب اور معلوم نہیں کتنے کارخانوں کے داروغاؤں کے جم غفیر نے سلام کے لئے ہجوم کیا۔ پھر سیاہ پلٹن، انگریزی پلٹن، پلٹن خاص برداران اور بچھیرہ پلٹن کے کرنیل اور کپتان آگئے۔ بچھیرہ پلٹن کہ شہزادہ جواں بخت کی عمر کے سپاہیوں پر مشتمل تھی جب سامنے کے میدان سے گذری تو دل کا عجب عالم ہوگیا۔ سولہ سترہ سال کے کپتان نے تلوار نکال کر سلامی دی کہ جان نکال کر قدموں میں ڈال دی۔ معلوم نہیں انگریز کی کس توپ کا چارہ ہوا۔ دوپہر رات گئے جب ہجوم کم ہوا تو بادشاہ نماز کے لئے اٹھا۔

"آج میرزا نوشہ ہمارے ساتھ نماز پڑھیں گے۔"

"ظلِ سبحانی کا سر آنکھوں پر۔"

موتی مسجد بقعۂ نور بنی تھی محراب میں جگمگاتا ہوا سچے موتیوں کا گچھا ستاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ نماز کے بعد آنکھ کا اشارہ ہوا اور مسجد خالی ہوگئی۔ جیب سے ایک اشرفی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"ظلِ سبحانی۔"

"میرزا نوشہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اکبر و جہانگیر ہو گئے۔ خانۂ خدا کی قسم کس کو یقین آئے گا کہ ولی عہد بہادر کو بھی یہی ایک اشرفی نصیب ہوگی۔"

"ظلِ الٰہی۔"

"لیکن ظلِ الٰہی تو جا چکے تھے۔ اشرفی اس کے ہاتھ پر ایک زخم کی

طرح رکھی تھی اور وہ کھڑا تھا۔

حضرت دہلی کی عیدیں دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا تھا لیکن وہ رات عجیب رات تھی۔ جیسے سارا شہر بازاروں میں اتر پڑا ہو دوکانوں میں امڈ آیا ہو، سڑکوں پر نکل آیا ہو۔ چاندنی چوک سے اجمیری دروازے تک کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے لئے ذراسی خریداری میں آدھی رات ہو گئی۔ صاحبقرانِ ثانی شاہجہاں کے عہد زریں میں بھی چاندرات ایسی ہی ہوتی ہو گی۔ لال حویلی کے پھاٹک پر دستک دی تو دیر کے بعد کھڑکی کھلی۔ شب خرابی کے کپڑوں میں بھی چغتائی بیگم ڈھلتے آفتاب کی طرح فروزاں تھیں۔ اس نے اشرفی ہاتھ پر رکھی تو ہاتھ کھینچ لیا۔

"آج اس تکلف کی کیا آفت آئی ہے میرزا صاحب"۔

"تم کو دیکھے ہوئے سینتیس سال ہو گئے تم کو چاہتے ہوئے پینتیس برس بیت گئے ہم نے کبھی تم کو کچھ نہ دیا لیکن آج یہ ایک اشرفی رکھ لو۔ یہ پہلی اشرفی ہے جو غالب کو عید منانے کے لئے بادشاہ کے ہاتھ سے میسر آئی ہے۔ یہ ایک اشرفی نہیں ہے، تخت ہندوستان کے ولی عہد کی عیدی ہے۔ خدا کی قسم آج ہماری نگاہ میں اکبر و جہانگیر کے ملک الشعراء حقیر ہو گئے کہ دولت مغلیہ کا کون ملک الشعراء ہے جسے ولیعہد کی عید نصیب ہوئی ہو۔ جس کے عمر بھر کے انعام واکرام اس خزانے کی گرد کو پہنچ سکتے ہوں"۔

"بیشک یہ اشرفی نہیں خزانہ ہے اور میں اسے گلے کا ہار بنا کر رکھوں گی۔"

شہر کی طرح اس کی گلی بھی جاگ رہی تھی۔ دونوں بچے اپنے اپنے کپڑے اور جوتے سرہانے دھرے نہ صرف بیدار تھے بلکہ اچھل پھاند رہے تھے۔ امراؤ بیگم عورتوں کی پوری ڈار کے ساتھ مصروف تھیں۔ بچے اپنا سامان کھول کر بیٹھ گئے اور وہ دیوان خانے میں چلا آیا۔ خفتان اتار رہا تھا کہ چار کا گجر بج گیا۔ تکیے پر سر رکھا تو خیالوں کا پٹارا کھل گیا۔

عیدگاہ پر ساری دلّی سمٹ آئی تھی۔ دروازے کے ایک طرف جنرل بھوانی رام کیسری باناپہنے، جڑاؤ ہتھیار لگائے، دولھا بنے ہاتھی ایسے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ دوسری طرف جنرل صمد خاں زردوز کفتان پر سبز چادر ڈالے سر سے پانوں تک ابجی بنے مچلتے گھوڑے پر جمے تھے۔ ان کے پیچھے دور تک ان کے رسالوں کے گھوڑے موجیں مار رہے تھے۔ پیادوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ بوڑھے اور بچے تک ہتھیاروں سے لیس تھے۔ پھر بڑے بڑے اونٹوں پر دھرے ڈنکے بجنے لگے۔ ان کے پیچھے مجاہدین کے دستے آرہے تھے۔ کم تھے جن کے لباس ثابت اور ہتھیار پورے تھے۔ لیکن آنکھوں میں وفا اور چہروں پر جلاوت کی چمک تھی۔ اور ان کے جھنڈوں پر بالاکوٹ کی ناکام لڑائیوں کی خونیں تاریخ لکھی تھی۔ پھر شاہی نشانوں کے ہاتھی نظر آنے لگے۔ سب سے آگے ایک بہت بڑے ہاتھی پر مغلوں کا روایتی جھنڈا تھا۔ اس کے

اردگرد سواروں کی ننگی تلواریں چمک رہی تھیں۔ اس کے عقب میں چھے ہاتھیوں پر طوغ وعلم اور نشان و اظہار تڑپ رہے تھے۔ پھر سیاہ پلٹن کے رسالے تھے۔ کم تھے جن کے بدن ستے اور گھوڑے چھکے تھے اکثر موٹے بھدے بوڑھے دبلے بیمار گھوڑوں پر ویسے ہی سوار دھراؤ کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ اب وہ سواری تھی جس کے سوار سے پوری دلی آشنا تھی۔ مولا بخش کی عماری میں بادشاہ تھا اور خواصی میں میرزا مینڈھو .... سلامی کی توپیں چھوٹنے لگیں۔ مولا بخش کے پیچھے بچھیرہ پلٹن کے سبزہ آغاز نوجوان عمائدین دہلی کے چشم وچراغ ولی عہد بہادر کی کمان میں اس طرح چل رہے تھے جیسے مقتل کے تماشے کو نکلے ہوں۔ اب میرزا مغل کمانڈر ان چیف کا ہاتھی تھا جو اپنے سوار کی طرح سر سے پاؤں تک زربفت واطلس میں ڈھکا ہوا تھا ان کی پشت پر شہزادوں اور سلاطینوں کی سواریاں کالے ربط انبوہ اور ہڑبونگ اور ان کے پیچھے حد نگاہ تک سواری سوار اور پیادے ہی پیادے۔ عیدگاہ کے دروازے پر مولا بخش کے پہنچتے ہی جنرل بھوانی رام کے اشارے پر فوجی باجے بجنے لگے۔ چاندی کے ڈرم اور مور بینیں اور جھلا جھل کی کمانیں اور جھانجھیں بجاتا ہوا ایک دستہ آیا۔ کمانڈر نے چاندی کی چھڑی سے بادشاہ کو سات بار سلام کیا اور چلا گیا۔ بادشاہ کے زمین پر قدم رکھتے ہی اللہ اکبر کے نعروں سے مسجد لرزنے لگی۔ صحن میں پہنچ کر بادشاہ نے مسجد کے امام کو تلوار اور خلعت عطا کی۔ اور اگلی صف میں بیٹھ گئے۔ داروغۂ آبدار خانہ نے صراحی کی مُہر

توڑی اور چاندی کے کٹورے میں پانی پیش کیا۔ بادشاہ نے ایک خواص کے ہاتھ سے بینی پاک لے کر منھ صاف کیا اور دست بستہ کھڑے ہوئے۔ امام کو دیکھ لیا اور نماز کے لئے صفیں کھڑی ہونے لگیں۔

نماز پڑھ کر وہ جانے کے لئے اٹھنے کو ہوا کہ دل نے کہا اس عیدگاہ کو پوری ایک صدی بعد ایسی نماز نصیب ہوئی ہے۔ دیکھ لو کہ شاید آخری نماز ہو۔ وہ بیٹھ گیا۔ بادشاہ خطبہ دے رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ سب کچھ ہے وہ تنظیم نہیں ہے جس کی ایک زنجیر میں شیروں اور بکریوں کی گردنیں بندھی ہوتی ہیں۔ یہ ایک شاندار توپ خانہ ہے لیکن بکھرا ہوا۔ بیٹھک کہیں، نال کہیں، گولہ کہیں، بارود کہیں، نشانہ کہیں، دشمن کہیں۔ ... اگر اس انبوہ کو کوئی بابر مل گیا ہوتا، کوئی اکبر نصیب ہو گیا ہوتا کیا قیامت ہوتا۔ بادشاہ اٹھا تو خواجہ سرا محبوب علی خاں، حکیم احسن اللہ اور الٰہی بخش اپنے اپنے مخبروں کی ٹولیوں کے ساتھ ہٹو بچو کرنے لگے۔ دلی کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ قول و عمل تو ایک طرف بادشاہ کا خیال تک یہ تینوں پہلی فرصت میں انگریزوں تک پہنچا رہے ہیں لیکن اگر نہیں جانتا تھا تو بادشاہ نہیں جانتا تھا۔ ایک بھیدی نے پوری لنکا ڈھادی۔ یہاں تو پورا قلعہ اور آدھا شہر بھیدی بنا ہوا تھا۔

گلی گلی کوچہ کوچہ عید کی مبارکبادیوں سے چھلک رہا تھا جیسے یہ بات سب کو معلوم ہو کہ شاید آج کے بعد یہ عید نہ آئے۔ جس کے پاس مسرتوں کا جتنا اندوختہ تھا دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔ جس کو جہاں سے

جتنا قرض مل سکتا تھا لے رہا تھا اور پھونک رہا تھا۔ اس کے گھر کبھی اتنے لوگ عید ملنے نہیں آئے۔ اتنی بے ریائی سے عید ملنے نہیں آئے۔ شاہ کو مبارکباد دینے جانے کے لئے اس کا ہوادار کھڑا سوکھ رہا تھا اور وہ لوگوں سے گلے مل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سوار ہونے کا موقع ملا۔ قلعے کے نقار خانے سے لال پردے تک آدمیوں کی گنگا جمنا بہ رہی تھی۔ باریابی ناممکن نظر آئی تو الٹے پیروں واپس ہوا اور لال حویلی کے لئے سوار ہوگیا۔

لال حویلی کے پھاٹک پر کھڑے ہوئے سپاہیوں کی بندوقوں کے غلاف تک نئے تھے۔ قدم رکھتے ہی بیگم کا سامنا ہوگیا۔

"بالوں میں مہندی سب لگاتے ہیں چغتائی بیگم لیکن جیسی تم پر رچتی ہے اور پھبتی ہے، ایسی دیکھی نہ سنی۔"

"اللہ میرزا صاحب! آپ بھول رہے ہیں۔ عیدی آپ مجھے رات دے چکے۔"

"تمہارے سر کی قسم بیگم صحیح کہہ رہا ہوں۔ تمہاری عمر کی عورتیں الگنی پر پڑی جھول رہی ہیں اور تم ہو کہ سر سے پانوں تک سارنگی کا تار بنی ہوئی ہو۔"

بیگم اس کے دامنوں پر عطر ملتے ہوئے بولیں۔

"اچھا اب مسند پر بیٹھئے تو منہ میٹھا کراؤں۔"

آن کی آن میں کنیزوں نے یہاں سے وہاں تک دسترخوان چن دیا۔ سقفی پنکھا چل رہا تھا لیکن ایک عورت فرشی پنکھا لے کر کھڑی ہوگئی۔ وہ

ٹوپی اور خفتان اتار کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"آج عید پر جو رونق ہے ایسی کبھی اور کبھی دیکھی میرزا صاحب؟"

"یہ رونق نہیں ہے بیگم مریض کا آخری سنبھالا ہے۔ بجھتی ہوئی شمع کی تڑپ ہے۔"

"اے نوج .... میرزا صاحب۔"

"زندگی بھر آپ نے کون سی میری بات مان لی جو یہ مان لیجیے گا۔ اچھا یہ بتائیے نواب کی کچھ خیر خبر ہے؟"

"جی ہاں بڑی دھوم کی عیدی آئی ہے۔ ایک سو ایک اشرفیاں اور ایک سو ایک تھان تو صرف میرے نام سے آیا ہے۔ سپاہیوں کا قول ہے کہ رسالے تیار ہو رہے ہیں، توپ خانے سج رہے ہیں۔ بڑی کڑک دھمک سے آنے کا ارادہ ہے۔"

اس خبر نے مکدر کر دیا۔ بیگم نانا کرتی رہیں لیکن وہ اٹھ کر سوار ہو گیا۔ دیوان خاص سے مجرا کر کے نکل رہا تھا کہ محلات عالیہ سے روتے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا میرزا ابوبکر سالار لشکر ہو کر ہنڈن ندی پر انگریزوں سے لڑنے جا رہے ہیں۔ سر سے پاؤں تک نوشہ بنے۔ دونوں بازوؤں پر امام ضامن کی پوٹلیاں باندھے برآمد ہوئے۔ میرزا مغل کمانڈر ان چیف نے کچھ ہدایتیں دیں جیسے خود بدولت درجن بھر پانی پت مار چکے ہوں۔ ان سے چھوٹ کر بیچارہ چھیل چھبیلا شہزادہ مجبوراً ہاتھی پر سوار ہو گیا۔ توپوں کی بیٹھکوں پر لوٹ کے مال کی گٹھریاں لدی تھیں۔ نالوں میں جھولیاں پڑی

تھیں۔ گھوڑوں کے ہرنے اور گردنیں اور پشتکیں، سواروں کے پہلو اور پشت
کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو سامان کے چھوٹے بڑے دست بقچوں سے خالی ہو۔
پیدلوں کی حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ سامان سے جس طرح لدے پھندے
تھے وہ تو خیر تھے ہی۔ ستم یہ تھا کہ اکثر کے ہاتھوں میں حقے تھے ہوئے
تھے، چلمیں سلگ رہی تھیں، دم لگ رہے تھے اور جو اس سعادت
سے محروم تھے وہ اُپلے دبائے ہوئے تھے، کوئلے سمیٹے ہوئے تھے۔ بھُنا
ہوا اناج پھانک رہے تھے اور پان چبا رہے تھے۔ لباس سے معلوم ہوتا
تھا کہ یا تو ڈاکہ ڈالنے جا رہے ہیں یا کسی کی برات میں شریک ہونے جا رہے
ہیں۔ ان کے درمیان کچھ سپاہی بھی تھے جو اس انبوہ میں اجنبی لگ رہے
تھے اور دور سے چمک رہے تھے اور ان پر ترس آ رہا تھا۔
دوسرا دن ڈوب رہا تھا کہ اس لڑائی کی سناؤنی آ گئی۔

•

ہنڈن ندی کے کنارے جب انگریزی توپ خانے کا سامنا ہوا تو
شہزادے بہادر جو دور ایک چھت پر کھڑے کمان کر رہے یا تماشہ دیکھ رہے
تھے قریب میں گولہ پھٹنے سے اس طرح بے حواس ہو کر بھاگے کہ ان کے
ہوا خواہوں کے بوجھ سے پل ٹوٹ گیا اور صرف دو سو آدمی ڈوب کر مر گیا۔
پھر شور ہوا کہ شہزادہ کرنل خضر سلطان اپنی پلٹن لے کر علی پور کی
طرف کوچ کر رہے ہیں۔ اس نے بھی ہزاروں تماشائیوں کی صفوں میں
گھس کر ان کی رخصتی کا دیدار کیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کچھ وہ دیکھ چکا
تھا صرف لشکر اور اس کے سالار کا نام بدل گیا تھا۔ انجام بھی وہی ہوا جو

ہو چکا تھا اور ہونا چاہئے تھا۔

وہ دن بھی اکثر دنوں کی طرح بری خبروں سے زرد ہو رہا تھا۔ ہوادار مفتی صدرالدین آزردہ کے مکان کے سامنے سے گذرا تو وہ اتر پڑا۔ اندر پہنچا تو دیکھا کہ مفتی صاحب اور حکیم آغا جان عیشؔ اور راقم الدولہ ظہیر دہلوی سب بُت بنے بیٹھے تھے۔ آداب و تسلیمات کے بعد آزردہ سے آزردگی کا سبب پوچھا تو انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر ظہیر دہلوی کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس کے اصرار پر وہ بولے۔

"جاسوس وزیر اعظم اور مخبر صاحب عالم الٰہی بخش نے نیلی وردیوں میں ملبوس دو سپاہیوں کو میرزا مغل کے سامنے پیش کیا۔ سپاہیوں نے تاریخ اور وقت اور مقام طے کر کے وعدہ کیا کہ جیسے ہی میرزا مغل کا انگریزوں سے سامنا ہوگا وہ اپنی پوری بٹالین کے ساتھ اپنی بندوقیں انگریز افسروں کی طرف گھما دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑی فتح ہو جائے گی۔ بیوقوف میرزا مغل کی بھولی فوجوں نے وقت مقررہ پر حملہ کر دیا اور چشم زدن میں پوری فوج کے دھوئیں اڑ گئے۔ سیکڑوں ہزاروں سپاہی اس سازش کی نذر ہو گئے اور انگریزوں نے پہاڑی پر توپ خانہ قائم کر کے اپنی قوت اور مستحکم کر لی۔"

مفتی صاحب جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوئے۔

"سبزی منڈی کی ترکاریاں اور پھل ہمیں دیکھنے کو نصیب نہیں اور انگریزی کیمپ میں جانور کھا رہے ہیں اور ہمارے بھائی پہنچا رہے ہیں۔

راقم الدولہ نے لقمہ دیا۔

"کتنے ہی مولویوں نے اعلان کر دیا ہے کہ یہ لڑائی ہماری لڑائی نہیں ہے۔ چلئے چھٹی ہوئی۔"

خادم نے میوے کی پلیٹیں اور فالودے کے گلاس لاکر رکھ دیئے۔ مفتی صاحب نے گاؤ تکیے سے ہٹ کر سب سے فرداً فرداً گذارش کی اور سبھوں نے گلاس اٹھالئے کہ خاموش رہنے کا بہانہ مل گیا۔ پان کے چنگیروں کے ساتھ سب کے سامنے حقے لگا دیئے گئے۔ کئی کش لے کر مفتی صاحب پہلی بار بولے۔

"جنگ پلاسی کی صد سالہ یادگار اس طرح منائی گئی کہ انگریز نے ہزاروں گردنیں کاٹ کر پھینک دیں اور قدسیہ باغ اور سبزی منڈی تک دھاوے کرنے لگے۔"

جی میں آیا کہ لڑائی کے انجام پر گفتگو کرے لیکن نواب تجمل حسین خاں کی نصیحت یاد آگئی۔ خاموش بیٹھا رہا۔

وہ محلسرا کے دسترخوان سے اٹھ رہا تھا کہ امراؤ بیگم نے دامن پکڑ لیا اور بولیں "جنس کا دانہ دانہ چک گیا۔ آدمی جن تنخواہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ کہاں تک بہلاؤں کیا کروں آخر۔"

وہ انتظار کا آسرا دے کر اٹھ آیا۔ دیوان خانے میں پہروں لیٹا سوچتا رہا کہ بادشاہ سے کیا کہے اور کس منہ سے کہے۔ نہ کہے تو کیا کرے۔ انگریزی پنشن تو خیر گئی قلعے کی تنخواہ تک کے لالے پڑے ہیں۔ معلوم نہیں کب سویا

کب اٹھا۔ ہوش آیا تو گلی میں ہنگامہ برپا تھا کہ بریلی سے بخت خاں چودہ ہزار سوار لے کر آگیا ہے۔ بادشاہ نے اپنے خسر نواب مرشد قلی خاں کو پیشوائی کے لئے شاہدرے بھیج دیا ہے اور پہاڑی پر فرنگی فوج میں سناٹا چھا گیا ہے۔

بادشاہ تخت طاؤس پر دربار کر رہا تھا کہ پختہ عمر کا ایک اونچا بھاری شاندار آدمی پیش ہوا۔ سر پر سفید اطلس کی پگڑی، بر میں سفید چکن کا نیچی چولی کا انگرکھا، کمر میں سبز زربفت کا پٹکا پہنے گلال بار پر کورنش کر رہا تھا۔ پھر آواز آئی۔

"لارڈ گورنر جنرل محمد بخت خاں بہادر کو مابدولت نے فوج کا اختیار کل اور شہر کا انتظام عطا کیا۔"

خلعت ہفت پارچہ مع رقوم جواہر عنایت ہوئی۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے کمر میں تلوار باندھی۔ وہ سلام کر کے الٹے قدموں واپس ہوا تو پیشوا نانا صاحب کا بھائی بالا صاحب پیش ہوا۔ لانبا اکہرا ادھیڑ آدمی خلعت پہن کر اور بادشاہ کے ہاتھ سے کیبوہ لگا کر رونے لگا۔ اس کے بعد مولوی سرفراز علی جو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوئے تھے باریاب ہوئے۔ دوپہر کی توپ تک جنرل بہادر کے ہمراہیوں کے نامی گرامی نام حاضر ہوتے رہے اور مجرا قبول ہوتا رہا اور خلعتیں تقسیم ہوتی رہیں۔ پھر اچانک وزیر اعظم نے دربار برخاست ہونے کا اشارہ کر دیا۔ جنرل بہادر کو بالا صاحب کے ساتھ روک لیا گیا۔ باقی تمام حاضرین کے ساتھ وہ بھی الٹے قدموں سلام کرتا واپس آگیا۔ سلاطین کی

گفتگو سے معلوم ہوا کہ بادشاہ جنرل کے ساتھ تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہے اور شہزادوں کے چہرے غضب سے لال ہورہے تھے۔ میرزا مغل اور میرزا ابوبکر جو فوج کی مدد سے بادشاہ ہونا چاہتے تھے بپھرے جا رہے تھے۔ لال پردے کے پاس ایک شہزادے نے اشارہ کیا۔

"غلام قادر کا خون ہے سلطنت کی نہیں عزت آبرو کی خیر منائیے صاحب عالم۔"

اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر جواب دیا۔

وہ پانی ملتان بہہ گیا۔ آنکھ ٹیڑھی کی تو سینے پر قرابین خالی ہو جائے گی۔"

"حضور جملہ خوب ہی ہو گیا۔ اک ذرا سینے کی جگہ پشت کر لیجئے تو کیا مضائقہ ہے۔"

اور خوشامدیوں نے قہقہہ لگایا یعنی اپنی روٹی چپڑی اور چلتے ہوئے۔

نقار خانے کا عملہ فوجی بینڈ بجانے والوں کے کرتب دیکھ رہا تھا۔

قلعے کے دہلی دروازے سے لاہوری دروازے تک جنرل کی توپوں کا زخیرہ کھلا پڑا تھا جن کے اردگرد درجنوں ہاتھیوں اور سیکڑوں گھوڑوں اور ہزاروں پیدلوں کا پہرہ کھڑا تھا۔ رنگ برنگے جھنڈے اور پرچم لہرا رہے تھے اور دلّی کے منچلے گھٹا مسجد سے چاندنی چوک کے دہانے تک ہجوم کیے ہوئے تھے۔ جہادیوں نے جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر چھاؤنی ڈال دی تھی۔ دور تک ان کے اونٹ کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ اکا دکا گھوڑے

بھی نظر آرہے تھے۔ تمام بازاروں میں ایک ہی ذکر تھا۔ جنرل بہادر کی آمد کا ذکر تھا۔ جیسے بریلی سے بخت خاں نہیں آسمان سے مسیحا اتر پڑا ہو۔
اب ایک ایک مسجد پر جہاد کا فتویٰ لگا تھا۔ جگہ جگہ جہاد کے مسائل اور فضائل پر تقریریں ہو رہی تھیں۔ تمام بڑے بڑے عالموں اور مفتیوں اور مولویوں نے دستخط کر دیئے تھے۔ جنھوں نے انکار کیا وہ باندھ لیے گئے۔ اور مقدمہ قائم ہو گیا۔ جنرل کے حکم سے نمک اور شکر کا محصول معاف کر دیا گیا۔ تھانیداروں کو جرنیلی حکم پہنچا کہ علاقے کی بدامنی کی ذمہ داری تمھاری گردن پر ہوگی۔ شہزادوں کا پروانہ ملا کہ شہر کے انتظامی معاملات میں دخل اندازی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی اور پورے شہر میں جیسے سکون ہو گیا۔ اسی سکون کے زمانے میں وہ چاندنی چوک سے گذر رہا تھا کہ اچانک بازار میں ہلچل مچ گئی۔ وہ نہر کے کنارے ہوادار سے اتر پڑا۔ سامنے عطر کی دوکان پر جنرل بخت خاں گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ مسلح سواروں کا رسالہ دور تک بکھرا ہوا تھا۔

"عطر لاؤ... سب سے عمدہ عطر لاؤ۔"

جنرل بہادر نے گرج کر حکم دیا۔ دوکاندار نے گھگھیا کر دیکھا اور ایک کنٹر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیش کیا۔ جنرل نے کاگ اڑائی، سونگھا اور رکابوں پر گھوم کر پورا کنٹر اپنے سیاہ گھوڑے کی دم پر انڈیل دیا اور کنٹر دوکان پر پھینک آگے بڑھ گیا۔ وہ دیر تک جہاں کھڑا تھا کھڑا رہا اور دوکاندار دونوں ہاتھوں میں کنٹر تھامے بیٹھا رہا۔

چاک چاک دنوں اور تار تار راتوں کی رفوگری سے انگلیاں فگار تھیں۔ قلم سنبھالے نہ سنبھلتا تھا کہ چار چھے دبیز اور جسیم مولوی صاحبان نے بغیر ہانکے پکارے سلاما لیکم کا بگل بجایا اور ہلّہ بول دیا اور بغیر کسی تامل کے جس کو جہاں جگہ ملی پھیل کر بیٹھ گیا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں ؟"

اس نے اپنی آگ گھونٹ کر کہا۔

"آپ کو معلوم ہوگا کہ دین پر وقت آپڑا ہے۔ ہزاروں جہادی یہاں پڑے ہوئے جانیں قربان کردینے کا انتظار کررہے ہیں۔ ہم لوگ ان کی مدد کے لئے ..."

"آپ کو معلوم ہے کہ میں کون ہوں ؟"

"جی ہاں ... نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ نواب میرزا اسداللہ خاں بہادر ہیں آپ۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ میری نوابی کی جاگیر کیا ہے۔ باسٹھ روپے مہینہ پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی اور پچاس روپلی ماہوار تنخواہ جو دربارِ شاہی سے مقرر ہے۔ تیسرا مہینہ کہ نہ اُدھر سے ایک کوڑی ملی اور نہ اِدھر سے ایک حبّہ نصیب ہوا۔"

"خیر اگر آپ نقد نہیں دے سکتے تو کوئی بات نہیں۔ چار آدمیوں کا کھانا قریب کی کسی مسجد میں بھجوا دیا کیجئے۔"

"جناب والا میں نے آپ سے ابھی عرض کیا کہ ..."

"آخر کھانا تو آپ کے یہاں پکتا ہوگا۔"

"جی نہیں..... میرے یہاں کپڑے پکتے ہیں۔ میں کپڑے کھاتا ہوں۔ سن لیا آپ نے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا اور بھرّا مار کر اٹھے۔ نکلتے نکلتے کسی نے کہا۔

"نواب صاحب یہ جو مسجد ہے آپ کے پڑوس میں یہاں دونوں وقت بال بچوں کو لے کر آجایا کیجیے اور کھانا کھا لیا کیجیے۔"

وہ سن ہو کر رہ گیا۔

پہروں سوچتا رہا کہ اگر ان جہادیوں کے ہاتھ پر ملک فتح ہوتا ہے تو انجام کیا ہوگا۔ شام ہوتے ہوتے نواب امین الدین احمد خاں بہادر آگئے۔ مصافحہ کر کے مسند کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے۔ خاصدان اور پیچوان سے تواضع کی پھر پوچھا۔

"آپ کہ والیِ ملک ہیں، فرمائیے ملک کا کیا حال ہے؟"

"ہم تو ایک مدت سے خانہ نشین ہیں۔ خبر اور افواہ کا فرق بھی جاتا رہا۔"

دیر کے سکوت کے بعد نواب بولے۔

"ملک کا حال عجیب سا ہے۔ جنرل بہادر نے علی پور تک انگریزوں کو ڈھکیل دیا ہے۔ لکھنؤ فتح ہو چکا، کانپور فتح ہو چکا، آگرہ فتح ہو چکا۔ جہاں سے آتی ہے فتح کی خبر آتی ہے۔"

"لیکن پہاڑی پر تو انگریز ڈٹا ہوا ہے۔"

"کب تک ... پنجاب کے راستے مسدود ہوئے اور اس نے ہتھیار ڈالے۔ کمانڈر ان چیف جنرل ریڈ نے استعفیٰ دے دیا۔ چمبرلین مارا گیا۔ سنا ہے کہ اب ولسن کمانڈر ان چیف مقرر ہوا ہے۔ بس جنرل بہادر اور میرزا مغل کی چپقلش ذرا الجھن بنی ہوئی ہے ورنہ ..."

"بہر حال تم کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"وہ تو ہے۔ بادشاہ نے کتنا اصرار کیا لیکن ہم نے قلم دان وزارت قبول نہ کیا۔"

"ہاں میاں کتنے ہیں جن کو روٹی تمھارے ہاتھ سے ملتی ہے۔ اپنا نہیں تو ان کی روٹیوں کا خیال رکھنا۔"

وہ لال حویلی کے لئے سوار جامع مسجد کے نیچے سے گذر رہا تھا کہ ڈنکے بجنے لگے۔ چشم زدن میں بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔ ڈنکے کے اونٹوں کے پیچھے پچاس پچپن سال کی ایک مضبوط عورت سیاہ گھوڑے پر سوار کھڑی تھی کفن پہنے، بندوق لٹکائے، تلوار باندھے ڈنکے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ آواز تھمتے ہی نیام سے تلوار نکالی آسمان کی طرف بلند کی اور بڑے طنطنے سے گرجی۔

"خدا نے تمھیں بہشت میں بلایا ہے۔ جس کو چلنا ہے ہمارے ساتھ چلے۔"

اس کی آواز میں بھی اس کے چہرے کی طرح تاب باقی تھی۔ اللہ اکبر

کا نعرہ بلند ہوتے ہی نوجوانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس کے ساتھ ہولئے۔ وہ انھیں دیکھتا رہا جب تک نظر آتے رہے دیکھتا رہا۔ پھر واپسی کا حکم دیا۔ گھر پہنچ کر تکیے پر سر رکھ دیا۔ سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ سر پھٹنے لگا۔

موسموں کی رنگینی تو پہاڑوں کو رنگ زار بنا دیتی ہے۔ وہ تو آدمی تھا۔ محلسرا سے بیسنی روٹی کھا کر آیا تو پانی پھر برسنے لگا تھا۔ داروغہ کو حکم دیا کہ جیسے ہی پانی تھمے پالکی لگا دی جائے اور خود گاؤ تکیے سے پشت لگالی اور پیچوان کے گھونٹ لینے لگا۔ مینہ ذرا کی ذرا تھما بھی تو اس طرح کہ سارے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اس نے ٹٹول کر اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں لیکن سوار ہو گیا۔ ہوا ایسی نم اور خنک تھی کہ بوڑھی خشک ہڈیاں نم ہو گئیں تر ترا گئیں۔ بازاروں میں پکوانوں اور مٹھائیوں کی دوکانوں پر آدمیوں کے ٹھٹھ لگے تھے اور اشتہا انگیز خوشبوؤں کے بادل امڈ رہے تھے۔ عورتیں گلابی اور دھانی پوشاکیں پہنے پور پور میں مہندی رچائے سولہ سنگھار اور بتیس ابرن کئے بجلیاں گراتی پھر رہی تھیں۔ اس نے سوچا یہ عام لوگ اسی طرح رہیں گے جیسے موسم اسی طرح رہیں گے۔ حکومت بادشاہ کی ہو یا کمپنی کی، یہ اسی طرح کھلتے رہیں گے۔ کیسی کیسی آندھیاں آتی ہیں، طوفان اٹھتے ہیں، بڑی بڑی عمارتیں ڈھے جاتی ہیں، کوہ پیکر درخت اکھڑ جاتے ہیں لیکن سبزہ اسی طرح بچھا رہتا ہے۔ نرکل کے درخت اسی طرح جھومتے رہتے ہیں۔ جیسے انقلابیوں کی تہہ بانی پر ہنس رہے ہوں۔ لال حویلی کے دربانوں نے

تھوڑی سی کھڑکی اس طرح کھولی جیسے کوئی آہٹ لینے کے لئے آنکھ کھولتا ہے۔ کنیزوں نے پیشوائی کی اور مسند پر بٹھادیا۔ بیگم دیر کے بعد آئیں اس نے دیکھتے ہی مصرعہ پڑھا ؏

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

"بیگم ... ہم بوجھ گئے۔"

"کیا؟"

"آپ مہندی دھو رہی تھیں۔"

"آپ تو ولی اللہ ہو رہے ہیں۔"

"ولی اللہ تو ہم ہیں۔ ولیوں کے ولی ہو جاتے اگر آپ سے عشق نہ ہوا ہوتا۔"

"توبہ اس بوڑھے منھ پر عشق کا لفظ کیسا کھپتا ہے ... اور مجھ گنہگار کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ لال پری کہتے لال پری، جس کے عشق میں گتیں بنوالیں۔ ورنہ دلّی ... پوری دلّی آپ کے پانوں دھو دھو کر پی رہی ہوتی۔"

"وہ تو اب بھی پی رہی ہے۔ پوچھیے کیوں کر ... ہمارے لئے دلّی کا نام چغتائی بیگم ہے اور چغتائی بیگم ....."

"آپ جانتے ہیں کہ یہ موسم مجھے کتنا پسند ہے۔ حد ہے کہ آپ کا تعارف بھی اسی کے واسطے سے نصیب ہوا۔ موسم برشگال پر آپ کے اشعار نہ سنے ہوتے تو .... خیر چھوڑیئے، میں یہ کہہ رہی تھی کہ کل سے کیسی دھوم کی بارش ہو رہی ہے لیکن ایک آنکھ نہ بھائی۔"

"وہ کیوں ؟

"لیجیے، یہ بھی میری زبان ہی سے سننے پر مصر ہیں ۔۔۔ آپ کہاں تھے ؟"

"اے سبحان اللہ ... میں قربان"

اس نے کھڑے ہو کر فرشی سلام کیا ۔ بیگم لال ہو گئیں اور آنچل میں چھپ کر بولیں ۔

"جنرل بہادر بخت خاں نے انگریزوں سے تیس ہزاری چھین لی ۔ کل صبح جنرل گردھاری سنگھ نے پہاڑی پر دھاوا کیا تھا لیکن موئی اس کمبخت بارش نے ان کی بارود بھگو دی نہیں تو پہاڑی کل ہی چھین لی گئی ہوتی ۔"

"ایک بات کہوں بیگم ۔"

"فرمائیے ۔"

"خدا جس قوم کو عروج دینا چاہتا ہے فطرت کے اشارے بھی اس کی سہولت کے مطابق ہوتے ہیں ۔ یہی بارش تو تھی جس نے پلاسی کی جنگ سراج الدولہ کے ہاتھ سے چھین کر کمپنی بہادر کی گود میں ڈال دی ۔ اسی بارش نے عین بارش کے موسم میں منھ پھیر لیا تو ٹیپو اپنی پوری فوج کے ساتھ چل مرا ۔۔۔ تو بیگم یہ پانی نہیں برس رہا ہے ، قدرت کا فیصلہ برس رہا ہے ۔ خیر کسی کنیز کو حکم دیجیے کہ ہماری تر دامنی کا سامان کرے ۔"

"کنیزیں موئی کیا کر پائیں گی ہم خود اٹھتے ہیں ۔"

"آپ اٹھیں گی تو بارش تھم جائے گی اور ہم چاہتے ہیں کہ آج باغیوں

کا پورا بارود خانہ بہہ جائے۔"

"میرزا صاحب!"

"آپ کے سر کی قسم چغتائی بیگم اب یہ قوم جس کا نام مسلمان ہے حکومت کے قابل نہیں رہی۔ پوری انسانیت کے ساتھ ظلم ہو جائے گا اگر اس قوم کو حکومت سونپ دی گئی۔ جس قوم کے حاکم حکم بیچنے لگیں، عالم علم فروخت کرنے لگیں اور منصف ذاتی منفعت کے ترازو پر فیصلے تولنے لگیں، اس کا مقدر ہے غلامی، اس کا نصیب ہے محکومی۔ آپ کو معلوم ہے اس قوم کے وہ افراد جو ہر قوم میں اس طرح ہوتے ہیں جس طرح برسات میں مینڈک ہوتے ہیں غالب کے گھر چڑھ کر آتے ہیں۔ اس بدنصیب سے یہ نہیں پوچھتے کہ تیرا کون ساغاقہ ہے۔ تیرے گھر میں تیرا چھوٹا بھائی مرض سے تڑپ رہا ہے کہ بھوک سے بلبلا رہا ہے۔ چندہ مانگتے ہیں نہیں قرضہ طلب کرتے ہیں اور جب ان کی حیوانی کے جہنم کا پیٹ نہیں بھرتا تو ذلیل کر کے چلے جاتے ہیں اس نشے میں کہ ان کی حکومت آنے والی ہے۔"

"میرزا صاحب!"

"یہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ غالب دہلی کے تنگ نظر اور کوتاہ اندیش سماج میں ایک سیاہ بھیڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تم نے ہندوؤں کو دیکھا۔ رامائن اور مہابھارت کے خالق کو نہیں پرتھوی راج راسو کے بھاٹ کو وہ عزت دیتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے ملک الشعراء شرما جائیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہم کس ملک میں پیدا ہوئے، کس قوم میں پیدا ہوئے

اور اگر پیدا ہونا ہی مقدر ہو چکا تھا تو جانور ہوئے ہوتے کہ شدتِ احساس کے تازیانوں سے محفوظ رہتے۔"

"اچھا ہاتھ تو چھوڑیئے۔"

"مغل بچے ہاتھ چھوڑنے کے لئے نہیں پکڑا کرتے۔"

"اے صنوبر... کہاں مرگئی کمبخت۔ جا خوان لگا کر لا۔ دیکھ رہی ہے کہ میرزا صاحب تشریف رکھتے ہیں۔"

اور کتنی دلاسائی اور دلداری سے اس کے زخموں پر مرہم رکھتی رہیں۔

اس دن امراؤ بیگم نے دوشالہ بیچ کر چولہا جلایا تھا۔ جیل کی روٹیوں کی طرح روٹی توڑ کر اٹھا تو اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ جامع مسجد کے سامنے کھڑا تھا اور سبز اونٹوں پر رکھے ڈنکے بج رہے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے منادی ہو رہی تھی۔

"بقرعید کے موقع پر اگر کسی نے گائے کی قربانی کی تو اسے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

لوگ سمٹ سمٹ کر آنے لگے۔ چہروں پر ناگواری اور آوازوں میں گرمی پیدا ہونے لگی۔ شاہی دروازے پر ہجوم کھڑا تھا۔ جاسوسوں کا بادشاہ وزیر احسن اللہ خاں قربانی کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ پھر گائے کی قربانی کی فضیلت پر گل کترنے لگا۔

"غریب آدمی جتنے پیسوں میں ایک بکرا خرید سکتا ہے ان میں تھوڑے سے پیسے اور ملا کر گائے خرید سکتا ہے۔ بکرے پر ایک قربانی کا اور گائے پر

سات قربانیوں کا ثواب حاصل کر سکتا ہے اور یہ بھی کہ بادشاہ اپنے ہندو درباریوں کے دباؤ میں آ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جنرل بخت خاں نے اپنے سپاہیوں کے خوف میں بادشاہ کو یہ غیر شرعی اور کفر آمیز مشورہ دیا ہو۔ ہم کو میرزا مغل کے حکم کا انتظار کرنا چاہیئے۔"

نگاہ اٹھائی تو قربان علی بیگ سالک سلام کر رہے تھے۔ رسمیات کے بعد اطلاع دی کہ تمام تھانیداروں کے نام جرنیلی حکم آ گیا ہے کہ اپنے اپنے علاقوں کے تمام بڑے جانور کھول کر تھانوں میں بند کر لو۔ قصائیوں کے گھروں میں گھس کر جانور چھین لو اور کھالوں کی گنتی کر لو۔ مضافات سے جو شخص گائے بیچنے لائے اسے اپنے قبضے میں لے لو۔ جو مزاحمت کرے اسے باندھ لو اور اعلان کر دو کہ گائے کی قربانی پر موت کی سزا دی جائے گی تھوڑی دیر گذری تھی کہ دو گھوڑوں کی بگھی پر جنرل بہادر آ گئے۔ مجمع کے قریب پہنچ کر بگھی پر کھڑے ہو گئے اور گرجنے لگے۔

"بھائیو! انگریز کے ہاتھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ کا سب سے بڑا حربہ گائے کی قربانی ہے اور اسی ہتھیار کے بوتے پر وہ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ شہر کے غدار مسلمانوں اور ہندوؤں سے سازش کر کے اس نے منصوبہ بنایا ہے کہ بقر عید کے دن جب گائے کی قربانی پر ہندو مسلمان لڑ رہے ہوں گے وہ حملہ کر کے شہر فتح کر لے گا۔ اس لیے ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے گائے کی قربانی ختم کر دی۔ جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا اسے پھانسی

پر چڑھادیا جائے گا۔ بادشاہ کو معلوم ہے کہ قلعے کے کچھ غدّار شہزادے شہر کے غدّاروں کو قربانی پر اکسا رہے ہیں۔ لیکن جس وقت بھی وہ پکڑے گئے ان کی ناکیں کٹوا دی جائیں گی۔"

گاڑی کے جنبش کرتے ہی جنرل بہادر کا نعرہ لگا لیکن بہت پھسپھسا تھا۔ شام تک اسی مضمون کے اشتہاروں سے ایک ایک مسجد کو بھر دیا گیا۔ دلی کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب کسی بادشاہ کے حکم سے ایسا اشتہار کسی مسجد پر چسپاں کیا گیا ہو۔ ایک خاموش سنسنی تھی جو سارے شہر پر مسلط تھی۔ قصائیوں کے گھروں پر پولیس کی دوڑ آرہی تھی بھینس کے بچے تک کی کھال کا حساب ہو رہا تھا۔ گھر گھر گایوں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ کوچہ کوچہ منادی پٹ رہی تھی۔ بقرعید کی رات بھی عجیب رات تھی۔ گلیوں کے پتھر سواروں کے گھوڑوں سے کڑکتے رہے اور گھروں کے دروازے پیادوں کی آوازوں سے بجتے رہے۔ بخت خان ساری رات گھوڑے پر سوار گشت کرتا رہا۔ بادشاہ نے عیدگاہ کے بجائے قلعے کی موتی مسجد میں بقرعید کی نماز پڑھی۔ تسبیح خانے میں اس کا مجرا قبول ہوا لیکن ٹھہرنے کا حکم نہ ملا۔ وہ الٹے پیروں واپس چلا آیا۔

بارود خانے میں آگ لگتے ہی نہ کہیں منادی ہوئی نہ کوئی نقارہ بجا لیکن ایک بدخبری تھی کہ کوچہ کوچہ کوٹھا کوٹھا گشت کرتی پھر رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے شہر کا رنگ زرد ہو گیا۔ آوازیں کھانستے لگیں مسکراہٹیں

رونے لگیں۔ بارود اشرفیوں میں تل رہی تھیں اور اشرفیاں ساہوکاروں کی کوٹھریوں میں بند تھیں اور ان پر انگریزی خوف کا پہرہ کھڑا تھا اور جو باہر تھیں وہ شہزادوں کی رنڈیوں کی گرہ میں قید تھیں۔ اور دھندلی آنکھیں قلعے پر لگی تھیں جہاں نقلی تخت طاؤس پر نقلی بادشاہ بیٹھا سپاہیوں کے پیٹ بھرنے کے لیے اپنی بیویوں کا زیور اتار رہا تھا کہ انگریزی توپوں کے گولے شہر کے گنجان محلوں کو تہس نہس کرتے قلعۂ مبارک کے صحن میں گرنے لگے، لال پردے کے اندر گرنے لگے اور جیسے پورے شہر کی بنیادیں کانپنے لگیں، شکست کے خوف کی آندھیاں چلنے لگیں۔ ہوش و حواس اور عزم و ثبات کے آشیانے اجڑنے لگے۔ دس دس برس کی بچیاں پچاس پچاس سال کے بڈھوں کے نکاح میں دے دی گئیں کہ آنے والا ہر روز روزِ جنگ تھا اور شب شبِ خون۔ بڑے بڑے خانوادے بھاگنے لگے تھے۔ وہ خاندان جن کے سپوتوں نے ہندوستان کی تاریخ ساز لڑائیوں میں موت کے سامنے گھٹنے گاڑ دیئے افواہوں پر اجڑنے لگے تھے کہ شہر کے باہر انگریز کا قبضہ تھا اور شہر کے اندر افواہوں کی حکومت تھی۔ دن سامان کی فراہمی میں آبلہ پا اور راتیں اپنے پیاروں کے ہجر میں نوحہ بلب۔

پھر وہ رات بھی آگئی جس کا کٹا پھٹا چاند مسجد شاہجہانی کے گنبد پر تھک کر بیٹھ گیا تھا اور مسجد کے چاروں طرف حد نگاہ تک آدمیوں کا سمندر کھڑا تھا کہ شاہی دروازے کے سامنے شاہی ہوادار آکر تھم گیا۔ بادشاہ اپنے ہاتھوں میں ایک دستبقچہ لے کر اترا۔ چوبدار نے

لال مخمل کا غلاف کھول کر جوتیاں نکالیں لیکن بادشاہ ننگے پا نو سیڑھیاں چڑھ رہا تھا مسجد میں آدمی نہیں تھے۔ سیڑھیوں سے دالانوں تک آدمیوں کے سروں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے حوض پر شاہی تبرکات کا دستبقچہ امام کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور تیزی سے چلتا ہوا وسطی محراب کے نیچے آ گیا۔ دو رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو ساری مسجد سجدے میں پڑی تھی۔ اٹھا تو ساری مسجد اٹھ پڑی۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور بادشاہ گھٹنوں تک جھکے ہوئے سروں کے درمیان سر جھکائے گذر رہا تھا۔ شاہی دروازے کے قریب ایک سفید داڑھی نے جس کے سینے پر قرآن اور ہاتھ میں تلوار تھی عبائے شاہی کا دامن پکڑ لیا اور جیسے آسمان سے آواز آئی۔

"ظلِّ الٰہی۔

بادشاہ تھم گیا۔

" وزیر جاسوس اور امیر غدار ہو سکتے ہیں لیکن انسانی سروں کا یہ سمندر ظلِّ الٰہی پر نچھاور ہونے کو حاضر ہے۔ اپنے دادا کی اس مسجد کو جہاد کا مرکز بنا لیجئے، محمدی جھنڈا لہرا دیجئے۔ پھر دیکھئے پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔" بادشاہ نے مشعلوں کی روشنی میں اس کے چہرے کی تاب کو دیکھا۔ گردن ہلائی اور اس طرح بولا جس طرح بولنا اس کو زیب دیتا تھا۔

"ہم دلّی کو اپنے لئے نہیں دلّی والوں کے لئے چھوڑ رہے ہیں۔ بیاسی

برس کی عمر میں چغتائی بادشاہ موت سے نہیں ڈرتے ؛
بادشاہ آگے بڑھ گیا۔ پوری مسجد شاہی دروازے پر سمٹ آئی تھی اور ایک جھلک کے لئے زور آزمائی کر رہی تھی۔ شاہی دروازہ چھوٹا پڑ گیا تھا اور مسجد سے باہر کھڑا ہوا مجمع شاہی اور شاہی ہوادار ان کے بھنور میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا۔ اور شہر کے دلّی دروازے تک پہنچتے پہنچتے مسجدوں کے میناروں سے اذانیں بلند ہونے لگی تھیں۔
وہ دن بھی دلّی کی تاریخ کا عجیب وغریب دن تھا کہ شہر پر کسی کی حکومت نہ تھی۔ کوئی قانون نہ تھا۔ قانون کا کوئی محافظ نہ تھا۔ پہلی بار شہر اجنبی معلوم ہوا۔ پہلی بار ایسا خوف محسوس ہوا کہ ہڈیاں سرد ہونے لگیں۔ قلعے کی فصیلیں چھوٹی ہوگئیں۔ مسجد شاہی کے مینار ہلتے نظر آئے۔ خوف جو ایک مدت سے تعاقب میں تھا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ فیض بازار میں میاں بلاقی کے پھاٹک پر اتر پڑا۔ میرزا بلاقی نے آنکھوں پر چھجّہ بنا کر دیکھا۔ پہچان کر مصاحبوں کے ساتھ مسند سے اٹھے تھے کہ سڑک پر شور مچ گیا۔ پرشور آوازوں کی تعداد بڑھتی گئی، ان کا حجم بڑھتا گیا۔ میرزا بلاقی اس کا ہاتھ تھامے سڑک پر آگئے۔ خون میں نہاتے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں پر بہت سے سوار قدم قدم چلے آرہے تھے۔ ان کے سینوں پر زخم اور پشت پر غار تھے اور وہ رکابوں پر پاؤں رکھے اور ہاتھوں میں لگامیں تھامے اس طرح چلے آرہے تھے جیسے انھوں نے زخم نہیں کھائے ہیں پھولوں کے گلدستے سجائے ہیں۔ وہ چلے گئے لیکن

میرزا بلاقی اس کا ہاتھ تھامے اسی طرح کھڑے تھے۔ دیر کے بعد مرے مرے قدموں سے چلے اور مسند پر ڈھیر ہو گئے۔ کسی خدمت گار کے کان میں کچھ کہا وہ ہاتھ باندھ کر چلا گیا۔ ایک خوان لے کر حاضر ہوا۔ میرزا نے سرپوش ہٹایا۔ چاندی کی دو غوریاں رکھی تھیں جن کی تری میں تھوڑے تھوڑے ابلے چنے پڑے تھے۔ میرزا بلاقی نے ایک غوری میں چمچہ ڈال کر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اسے پیش کیا۔ دوسری غوری اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی آدمی کا سایہ تک نہ تھا۔

"بسم اللہ کیجئے میرزا صاحب!"

میرزا بلاقی نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں میرزا بلاقی کی کی میت پر فاتحہ پڑھئے میرزا صاحب۔ اس نے ایک چمچہ رکھ کر میرزا کی طرف دیکھا۔ میرزا بلاقی اس طرح چنے کھا رہے تھے جیسے سچے موتی چبا رہے ہوں۔ الائچی دانوں کی ایک چٹکی کے ساتھ بیچوان کے دو گھونٹ لئے اور کھڑا ہو گیا۔ پھاٹک تک میرزا بلاقی اسے چھوڑنے آئے۔ وہ میرزا بلاقی کے افلاس اور اخلاق کے متعلق سوچتا ہوا سوار ہو گیا۔ ہوادار جامع مسجد کے سامنے پہنچا تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ شریعت اپنے فرزندوں کو آواز دے رہی تھی۔ تاریخ اپنے بیٹوں کو پکار رہی تھی۔ تہذیب اپنے شیدائیوں کو للکار رہی تھی۔ وہ ہوادار سے اتر پڑا۔ زندگی میں پہلی بار نماز محض کی نیت سے مسجد شاہجہانی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ آزاد مسجد میں آزاد نمازیوں کی آخری آزاد نماز کا تماشہ دیکھنے جا رہا تھا۔ کوئی لڑکا نہ تھا جس کی کمر

میں خنجر نہ ہو، کوئی بوڑھا نہ تھا جس کے ہاتھ میں برچھا نہ ہو۔ موجیں مارتے کفتان، چمٹے ہوئے انگرکھے، چُنے ہوئے کرتے، عمامے اور صافے اور کلاہیں اور طرّے اور کلغیاں، کیسی کیسی جمیل صورتیں اور جلیل داڑھیاں کہ فرشتے دیکھیں تو دیکھتے رہ جائیں۔ ایسی ایسی شکیل مورتیں کہ حوروں کی آنکھ پڑ جائے تو پہلوؤں سے دل نکل جائیں۔ ابھی صفیں کھڑی ہو رہی تھیں کہ شمالی دروازے پر کہرام مچ گیا۔ فرنگی فاتحوں کا پورا ایک بریگیڈ دروازے کے سامنے آگیا تھا۔ منبر کے سامنے مشورے ہو رہے تھے کہ ایک شخص دو آدمیوں کے شانوں پہ پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مومنو... شہادت کا وقت آگیا۔ حیات ابدی کا پیام آگیا شاہجہانی مسجد کا یہ دروازہ دروازہ نہیں دروازۂ جنت ہے آؤ اس دروازے سے گزر کر فردوس میں داخل ہو جائیں"۔

پوری مسجد شمالی دروازے کی طرف، جنت کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازہ کھلتے ہی جان ہارنے والوں کا انبوہ تکبیر کے نعرے بلند کرتا ہوا، ان کی تکرار کرتا ہوا ابل پڑا۔ مورچہ بند فرنگیوں کی سیکڑوں بندوقیں ایک ساتھ چلیں، سیکڑوں لاشیں ایک ساتھ گریں اور ہزاروں قدم ان کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بندوقیں چلتی رہیں، لاشیں گرتی رہیں اور زندہ قدم ان کو کچلتے آگے بڑھتے رہے۔ پھر بندوقوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ بگل بجنے لگے۔ کمانڈ کے انگریزی نعرے گرجنے لگے اور شمشیر بدست پیادے بندوقچی سواروں سے ٹکرا گئے۔ سواروں کو گھوڑوں سے کھینچ لیا۔ ذبح کر دیا

قتل کر دیا۔ جو بھاگے ان کا تعاقب کیا اور مارتے ڈھکیلتے کشمیری دروازے تک چلے گئے۔ مسجد اسی طرح آدمیوں سے بھری تھی۔ لاشیں لائی جا رہی تھیں زخمی اٹھائے جا رہے تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کسی طرف سے قمرالدین منت آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مسجد سے نکال لائے۔ محلسرا میں جب امراؤ بیگم اس کے کفتان کے تکمے کھولنے لگیں تو زندگی کی تہمت پر اعتبار آگیا۔ دستر خوان کی سفیدی پر پہلی بار کفن کا خیال آیا۔ غوریوں پر کرکولی ہوئی کھوپڑیوں کا گمان ہوا۔ امراؤ بیگم کو بہلا کر وہ دستر خوان سے اٹھ آیا۔ چلم جل چکی تھی لیکن وہ حقہ گڑگڑائے جا رہا تھا۔ دوسری چلم رکھ دی گئی۔ وہ اسی طرح گڑگڑاتا رہا۔ بیگم اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتیں اور سہم جاتیں۔ کتنے دنوں بعد وہ سارا دن محلسرا میں پڑا رہا۔ مدتوں بعد ایک ایسی شام آئی جو نشے کی طلب سے خالی تھی۔ پہلی بار وہ شام کی ہتھیلی پر شمع کی چٹکی بھر روشنی دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ پھر امراؤ بیگم جانماز سے اٹھیں، دارو غہ سے کچھ کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے کشتی رکھی تھی اور اس میں وہ سب کچھ تھا جو ہوا کرتا تھا لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ امراؤ بیگم اسے دیکھتی جاتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے دعائیں مانگتی جاتیں۔ پھر اچانک بندوقوں کے فیر ہونے لگے، ہوتے رہے۔ پھر ان کی آوازیں قریب ہونے لگیں اور پھر آوازوں کی دوسری قسم آنے لگی۔ پھر تیسری قسم، پھر چوتھی قسم۔ اتنی بہت سی قسموں کی ایسی بے محابا اور بے پناہ آوازیں اس نے پہلی بار سنی تھیں۔ خون

اگلتی آوازیں، جان دیتی آوازیں، اپنی موت کی اطلاع دیتی آوازیں، اپنے پیاروں کو فرار کی ترغیب دیتی آوازیں، اپنی مدد کو پکارتی آوازیں، اپنی مدد سے پکارتی آوازیں، لیکن ان کے جواب میں سیسہ و بارود کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔ ان کی مدد کو نہ آسمان سے شہید اترے اور نہ زمین سے غازی اٹھے۔ وہ قصاب خانے کے جانوروں کی طرح اپنی اپنی باری پر ذبح ہوتے رہے۔ کشمیری بازار سے دریا گنج تک محلّے کے محلّے قتل ہوتے رہے۔ ساری رات ذبح ہوتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے امراؤ بیگم کا دوپٹہ اتار کر پھاڑا اور اس کی دھجیوں سے اپنے کان بند کر لئے۔

سورج اسی طرح روشن تھا، دھوپ اسی طرح زندہ تھی۔ بندوقوں کی آوازیں اور مرنے والوں کی چیخیں اسی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان خاموشی کا چھوٹا سا وقفہ سنالے کی تلوار پر تل جاتا۔ ایسے ہی ایک وقفے میں ایک گھٹا گھٹا دھماکہ سا ہوا۔ پھر ایسے دھماکے ہوتے رہے۔ دیر تک ہوتے رہے۔ پھر داروغہ خبر لایا کہ فیض بازار میں عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی کی خبروں نے شریفوں کو بے حواس کر دیا ہے اور اکثر گھرانوں کے مردوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی عورتوں کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا ہے۔ یہ آوازیں اسی کی ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور پڑوس کے مکان پر دیوانہ وار دستک دی۔ دیر کی تفتیش کے بعد دروازہ کھلا۔ وحشی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور ہاتھ خون میں سنے ہوئے تھے۔

برادر یہ کیا کر ڈالا۔ ہمارے محلّے کے تحفّظ کے لئے مہاراجہ پٹیالہ نے

انگریزوں سے ضمانت لے لی ہے۔"

دونوں ہاتھوں میں دونوں پٹ تھامے وہ کھڑا رہا۔ پھر حلق میں پھنسا ہوا خنجر اگل دیا۔

"میرزا صاحب صدقے کی چڑیا تھیں کاٹ دیں۔"

"کتنی تھیں ؟"

"اٹھارہ۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ دارو نے سنبھال کر محل سرا میں پہنچا دیا۔ یوسف میرزا اپنے بچوں کے ساتھ دوسرے دالان میں بیٹھے تھے۔ امراؤ بیگم نے اسے لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا کاغذات کا صندوقچہ کھول کر انگریز افسروں کے خطوط کا وہ لفافہ نکالا جو اسی مقصد کے لئے سنبھال کر رکھا تھا۔ کئی خط نکالے اور صدر دروازے پر چپکوا دیئے۔ ایک گھڑی گذری تھی کہ گلی میں قیامت مچ گئی۔ گھروں کے دروازے ٹوٹنے لگے۔ مردوں کے ساتھ عورتیں اور بچے تک ذبح ہونے لگے۔ اس کے دروازے پر بھی بندوقوں کے کندے برسنے لگے۔ اس نے عورتوں کو تہ خانے میں ڈھکیلا اور اس کے منہ پر تخت بچھا کر اور لکھنے پڑھنے کا سامان پھیلا کر بیٹھ گیا۔ یوسف میرزا نے دروازہ کھول دیا۔ کتنے ہی گورے ہاتھوں میں طمنچے اور بندوقیں لئے گھر میں گھس آئے۔ وہ تخت پر دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ گورے گھر میں اس طرح ٹہل رہے تھے جیسے جیلر قیدیوں کی کوٹھریوں کا معائنہ کرتا ہے۔ ایک

طمنچے کی نال نے اس کے ہاتھ نیچے کر دیئے۔

"شاعر گالب ؟"

کسی نے کہا۔ اس نے گردن ہلا کر تائید کی۔

"پہاڑی پر کیوں نائیں آیا ؟"

"بوڑھا آدمی ہوں۔ چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ اگر پہنچ بھی جاتا تو سنتری گولی مار دیتا۔ اگر بچ کر واپس آجاتا تو بخت خان پھانسی پر چڑھا دیتا۔ دعا کر سکتا تھا، گھر میں بیٹھا کرتا رہا۔"

گورے نے اس طرح دیکھا جیسے بادشاہ گنہگاروں کی جان بخشی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ گوروں کے باہر جاتے ہی یوسف میرزا نے دروازہ بند کر لیا۔ بے آبرو ہوتی ہوئی عورتوں کی چیخوں، قتل ہوتے ہوئے مردوں کی فریادوں اور جلتے ہوئے مکانوں میں بھنتے ہوئے بچوں کی پکاروں کے درمیان اس نے اپنی سلامتی پر اطمینان کا سانس لیا۔

جلتے گوشت کی بدبو سے بوجھل دھوئیں کے بادل گھرے ہوتے جا رہے تھے اور سانس لینا دم بدم دشوار تر ہو رہا تھا اور زمین سخت تھی اور آسمان دور تھا اور زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ وہ زندہ تھا اور شام ہو رہی تھی کہ وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک تک امراؤ بیگم تہ خانے میں بند تھیں۔ تہ خانے کی بڑی سی قبر میں شمع جل رہی تھی۔ امراؤ بیگم کا ہیولہ اس کے حقیقی بھائی کی بیوی کی پرچھائیں کے پاس بیٹھا تھا جس کی گود میں چھوٹی بچی پڑی تھی اور بڑی بچی اس کے پہلو سے لگ کر سو چکی تھی اور

امراؤ بیگم اس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی تھیں ۔
"کیا ہوا ... کیا ہوا آخر ؟"
"کچھ بولئے تو ... خدا کے لئے بتلائیے تو !"
امراؤ بیگم نے گود کی بچی اٹھا کر اس کے ہاتھوں پر رکھ دی۔ ٹھنڈی لکڑی کی گڑیا اس کے ہاتھوں پر آئی تو وہ کانپنے لگا۔ اس نے امراؤ بیگم کو دیکھا۔ نہیں امراؤ بیگم پر اس کی آنکھیں چیخ پڑیں ۔ امراؤ بیگم کہیں دور سے بولیں ۔
"گوروں کے بوٹوں کی آواز پر اس نے رونے کے لئے منہ کھولا اور بیگم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا !"
وہ بچی کی لاش لے کر باہر نکلا۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ یوسف میرزا کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ وہ ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ گردن نکال کر دیکھا تو خون خشک ہو گیا۔ یوسف میرزا زخمی پڑے تھے۔ بڑے جتن سے انھیں کھینچ کر اندر لایا۔ دروازہ بند کیا اور انھیں کے سہارے ڈھیر ہو گیا۔ یوسف میرزا کی بیوی اور ان کی زندہ بیٹی دونوں داہنے بائیں بیٹھی تھیں اور امراؤ بیگم پاگلوں کی طرح ماری ماری پھر رہی تھیں۔ ریشم جل رہا ہے ، مرہم بن رہا ہے۔ آدھی رات کے بعد یوسف میرزا نے آنکھیں کھولیں تو جان میں جان آئی ۔
ایک دن گذر گیا ایک جنم بیت گیا۔ ایک رات بسر ہوئی ایک عمر تمام ہوئی لیکن کہیں سے نہ تو گولی کی آواز آئی نہ فریاد کی صدا۔ تاہم سماعت

ہولناک آوازوں سے تار تار تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے چھت پر چڑھا۔ دور دور تک کوئی روشنی نہ تھی، روشنی کا فریب تک نہ تھا۔ زندگی کا گمان تک نہ تھا۔ جلے ہوئے گوشت کی بو اور گاڑھی سیاہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ دن چڑھتے چڑھتے دروازے پر مانوس تھپکی ہوئی۔ اس نے پہچان کر دروازہ کھول دیا۔ کلو داروغہ نے دو پوٹلیاں پکڑا دیں اور منہ پھیر لیا۔ گرم گرم چنے اور بھنی ہوئی جوار کے دانے دیکھ کر اس نے یاد کرنا چاہا کہ کون سا فاقہ ہے لیکن حافظہ کہاں تھا۔ حافظے کے نام پر ایک خون کا دریا تھا کہ موجیں مار رہا تھا۔

وہ بھی دوسروں کی طرح "چربینے" پر ہاتھ مارنے لگا۔ ڈگڈگا کر ایک کٹورہ پانی پیا تو آنکھوں میں روشنی آگئی۔ عرفان ہوا کہ زندگی کی بنیادی ضرورت نہ مذہب ہے نہ تہذیب نہ ادب ہے نہ فن اگر دو روٹیاں نصیب نہ ہوں تو دو مٹھی بھنا ہوا اناج ہی سہی۔ پانی چٹائی جلا کر انگارے بنائے۔ چلم بھری، دو چار کش لئے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ دلی کے حکیموں کے مربی مہاراجہ پٹیالہ نے انگریز سے عہد لیا تھا کہ فتح دہلی کے وقت حکیموں کا محلہ تاراج سے محفوظ رہے گا اور ایک حد تک محفوظ بھی رہا۔ بربادیٔ عام سے محفوظ محلے کا جب یہ حال ہے تو دوسرے بدنصیبوں پر کیا گذری ہوگی۔ وہ سوچتا رہا کہ سوچنے کے علاوہ کوئی عشرت اس کی دسترس میں نہ تھی۔

کسی کسی گھر میں کبھی کبھی چولھا جلنے لگا تھا اور زندگی پر اعتبار پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے خفتان پہنا تو امراؤ بیگم دامن سے لپٹ گئیں اور اس طرح

رخصت کیا جیسے وہ پہاڑی پر حملہ کرنے جارہا ہو۔ شریف خانی حکیموں کی ناک حکیم محمود خاں کے دروازے پر زندہ اور سلامت شریفوں کی صورت دیکھی تو جی چاہا کہ ان سے لپٹ جائے، سینے سے لگائے۔ حکیم نے اسے دیکھتے ہی اس طرح دسترخوان لگانے کا حکم دیا جیسے نبض دیکھ کر نسخہ بول رہے ہوں اور ہاتھ پکڑ کر کھانے پر بٹھا لیا۔ ایک ایک نوالے پر ایک ایک دعوت کا اصرار کیا۔ کتنے دنوں بعد پان چبا کر اناناس کے خمیرے سے مہکتی چلم کے گھونٹ لئے کئے پیشانی کا پسینہ گریبان پر پڑ آگیا تھا۔ جب تنہائی میسر آئی تو حکیم بولے۔

"مٹیا محل میں جہاں ظلِ الٰہی قید ہیں۔"

"جی کیا فرمایا آپ نے ؟"

وہ مسند سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"اتنی معمولی سی تمہید پر تڑپ اٹھے میرزا صاحب۔ محمود خاں کے سینے میں وہ کہانیاں دفن ہیں کہ اگر حکیم کا سینہ نہ ہوتا تو پھٹ چکا ہوتا۔ بہہ چکا ہوتا۔ حکیم احسن اللہ خاں اور الٰہی بخش نے ہندوستان کے ساتھ وہ کیا۔ جو جعفر اور صادق بنگال اور دکن کے ساتھ نہیں کر سکے۔ کم از کم ٹیپو اور سراج الدولہ میدان جنگ میں شہادت سے تو سرفراز ہو گئے۔ ہمارا بادشاہ چوہے کی طرح پکڑ کر بند کر دیا گیا۔ پندرہ ہزار سواروں سے دامن چھڑا کر ہڈسن کے سامنے ظلِ الٰہی کی تلوار رکھوا دی۔ کوتوالی کے سامنے شہزادوں کے گولی مار دی گئی۔ قید کی صبح ناشتے کے وقت بادشاہ نے خوان سے سرپوش ہٹایا تو چار جوان بیٹوں کے سر رکھے تھے۔ لیکن بیاسی برس کے بڈھے نے گرج

کر کہا" الحمد للہ جنت نی شہزادے اسی طرح سرخرو آتے ہیں۔ دیوان خاص میں عدالت بیٹھی ہے اور شاہجہاں کا پوتا سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر پانچ پانچ گھنٹے بیان دیتا ہے۔ موتی مسجد میں گورے جوا کھیلتے ہیں۔ شاہجہانی مسجد کے دالانوں میں فوجیوں کے گھوڑے بندھتے ہیں اور منبر پر سور ذبح ہوتے ہیں اور ہم زندہ ہیں"۔

"آپ کہہ رہے سب ....؟

"کہہ تو رہا تھا کہ مٹیا محل میں بادشاہ پر جو آدمی تعینات ہیں وہ ہمارے پروردے ہیں۔ دن بھر ڈیوٹی بجاتے ہیں اور رات بھر ہمارے کانوں میں زہر ٹپکاتے ہیں۔ قلعے کے ہزاروں آدمیوں میں سے بادشاہ اور جواں بخت کے ماسوا تمام کے تمام پھانسی پر چڑھ چکے یا گولی سے اڑائے جا چکے۔ پورے شہر میں کوئی خوبصورت مسلماں زندہ نہیں بچا۔ وہ امیر و رئیس جن سے دلی عبارت تھی سب کے سب مر چکے۔ چند ایک جو زندہ بچے ہیں قید میں ہیں۔ اور پھانسی کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"نواب!"

"خدا کے واسطے کسی کا نام نہ لیجئے گا میرزا صاحب۔ ایک ٹانکا ٹوٹا تو سر سے پاؤں تک بکھر جاؤں گا۔"

اور وہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ جہاں جو تھا دوڑ کر دروازے پر آ گیا۔ کھڑا ہوا اور واپس چلا گیا۔ دیر کے بعد جب دل تھما۔

"ہمارے تمام مکانات میں امراء و شرفاء کی وہ بہو بیٹیاں جو آ سکیں

"

مقیم ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کا حال پوچھتی ہیں۔ میں طوطا مینا کی کہانیاں سناتا ہوں۔ باہر آتا ہوں تو ننگے بھوکے بیگنا ہوں کی بھیڑ بیٹھی ہوتی ہے۔ روٹی دینا آسان ہے تسلّی دینا مشکل ہے۔"

ایک گھڑی نہ گذری تھی کہ روتے پیٹتے آدمیوں کا ہجوم آگیا کہ ہاتھی جن مکانوں کو ڈھا رہے ہیں ان میں بیوی بچّے پسے جا رہے ہیں۔ حکیم نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"خدا آپ کی عمر اور صحت میں میری عمر اور صحت کا پیوند لگا دے۔"

"غلام کو اطلاع دیئے بغیر سوار نہ ہو یئے گا۔ التماس ہے چودھری چمن اور منشی جمال الاسلام سے ہوشیار رہئے گا۔ یہ شریفوں کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔ شہزادوں کی تلاش کے بہانے گھروں میں گھس جاتے ہیں اور صاحبوں سے بہو بیٹیوں کے حسن و جمال کی مخبری کرتے ہیں۔ پھر فوج لاکر آبرو مند گھروں کی آبرو اٹھالے جاتے ہیں۔ دس روپئے فی عورت اور پانچ روپئے فی مرد کے حساب سے انعام وصول کرتے ہیں۔"

باہر نکلا تو شہر سنسنا رہا تھا۔ کان بج رہے تھے۔ پیر پرائے معلوم ہو رہے تھے کسی طرح گھر پہنچ کر پڑ رہا۔ امراؤ بیگم پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"خیر تو ہے۔"

"دعا کرو جتنا جو کچھ ہے اتنا ہی رہ جائے۔"

انھوں نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن روک دیا۔ سوچتے سوچتے سر پھٹنے

لگا تو اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کان میں کہا کہ یہی نظامِ قدرت ہے۔ سوچو سیکڑوں برس پہلے جب مسلمانوں نے ہندوؤں سے دلّی کو چھینا ہوگا تو کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔ مسلمان کہے گا اس سے کم ہوا ہوگا۔ ہندو کہے گا اس سے زیادہ ہوا ہوگا۔ اور خدا وہ تو نٹ کھٹ بالک ہے کبھی گڑھتا ہے کبھی توڑتا ہے۔ اور تقدیر.... ہمارا جھنجھنا ہے ہاتھیوں سے جو کھیت روندے جاتے ہیں وہ تقدیر سے روندے جاتے ہیں۔ جو بچ جاتے ہیں وہ تقدیر سے بچ جاتے ہیں۔ جو ہے وہ ہے جو نہیں ہے وہ نہیں ہے۔

ستمگری کی تمام رسمیں ستمبر کے مہینے میں تمام ہو چکی تھیں۔ اکتوبر کا اکٹوپس اپنے ہزار پیروں میں ہزار طرحوں کے ظلم پہنے بیگناہوں کو کچل رہا تھا۔ امراؤ بیگم نے شادی کا جوڑا بیچ کر چولھا جلایا تھا۔ وہ بہت دنوں بعد نہا کر دھلا جوڑا پہنے کھانے کا انتظار کر رہا تھا کہ گوروں کی دوڑ آگئی۔ وہ دروازہ بند کرنے لپکا۔ زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ پکڑ لیا گیا۔ ڈیوڑھی پر چسپاں انگریزوں کے دوستانہ خطوط نے جان بچالی۔ وہ سپاہیوں کے حلقے میں تھانے لے جایا جا رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچا تھا کہ میرزا یوسف کسی طرف سے نکل آئے اور "آ کا بھائی" کا نعرہ لگا کر اس کی طرف دوڑے۔ ابھی چند قدم کے فاصلے ہی پر تھے کہ بندوق کا فیر ہوا اور میرزا یوسف لوٹنے لگے۔ صاحب بہادر کے سامنے پہنچتے پہنچتے ہوش آ چکا تھا۔ اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔ جان بچانے کے لئے نہیں بلکہ بے آسرا عورتوں اور بچوں کی کفالت کا

احساس اپنی ساری صلاحیتوں کو مجتمع کر چکا تھا۔ صاحب بہادر کے منہ سے گولی نکلی۔

"تم مسلمان اے ؟"

"جی آدھا مسلمان ہوں۔"

"کیا مطلب ؟"

"شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔"

صاحب بہادر نے اسے غور سے دیکھا۔ چہرے کے غضب پر نرمی کی لہر سی دوڑ گئی۔

"تم نے بہادر شاہ کا سکّہ لکھا ؟"

"میں نے نہیں لکھا، مجھ پر الزام ہے۔"

صاحب بہادر نے گھوم کر منشی مہرالاسلام اور چودھری چمن کو گھورا جو کوٹ پتلون پر نکٹائی لگائے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

"اگر ثبوت مل گیا تو ؟"

"مجھے گولی ماردی جائے۔"

صاحب بہادر تھوڑی دیر مخبروں کو دیکھتے رہے۔ پھر گردن ہلائی۔ ایک کاغذ پر دستخط کئے اور چھوڑ دیا۔

تھانے سے باہر نکل کر نگاہ اٹھائی تو نگاہ رو پڑی۔ ڈیوڑھیاں ٹوٹی ہوئی، حویلیاں پھوٹی ہوئی۔ بازار لٹے ہوئے، راستے اجڑے ہوئے۔ مکان بھنکے ہوئے۔ وہ شاہجہاں آباد کے محلوں سے نہیں خراب آباد کے قبرستانوں

سے گذر رہا تھا۔ کھنڈروں کے عبرت خانوں سے نکل رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں حکیم محمود خاں چند ٹوٹے پھوٹے آدمیوں کے ساتھ موجود تھے۔ صحن میں میرزا یوسف کا جنازہ رکھا تھا۔ ایک طرف تیر کا گڈھا کھد چکا تھا۔ حکیم نے نماز پڑھائی اور لاش کو توپ دیا۔ بیوگی اور یتیمی کے آنسوؤں سے آنکھیں چرا کر وہ دیوان خانے میں پڑ رہا۔

بارود کی ایک ردا تھی جو حدِ نگاہ تک چھائی ہوئی تھی اور دلّی اپنی سہولت کے لئے رات کہتی تھی۔ تلواروں اور نیزوں کی چمک، بندوقوں اور توپوں کے دہانوں کی تڑپ کو کسی طلسم نے اسیر کر لیا، منجمد کر دیا اور اس کا نام دن رکھ دیا۔ ایسا ہی ایک دن تھا جب امراؤ بیگم آ گئیں۔ بغیر کسی اطلاع کے آ گئیں۔ وہ دیوان خانے کے زنداں کی ایک کوٹھری میں سوچنے کی سوچتے رہنے کی مشقت کاٹ رہا تھا۔ ان کو دیکھا تو کلیجہ ٹکڑے ہو گیا۔ وہ رو نہیں رہی تھیں۔ یہی تو رونا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو اپنی پوری طاقت سے دراز کر کے ایک تبسم کی تخلیق کے لئے پسینے پسینے ہوئی جا رہی تھیں۔ اس کو دیکھتی رہیں.... دیکھتے دیکھتے چیخ اٹھیں۔

"میرزا صاحب!"

الماری سے آئینہ اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ اس کا چہرہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں تھا۔ سر سے داڑھی تک ایک ایک بال سفید ہو چکا تھا آنکھوں کے گوشوں سے ہونٹوں کے کناروں تک شکنوں کے ڈھیر لگے تھے اور وہ اسی کا چہرہ تھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو نازنینوں کے زانوؤں پر آفتابوں کی

طرح چمکتا رہا۔ آفتاب ہر آفتاب کا مقدر ہے کہ ڈوب جائے۔ اس نے آئینہ اٹھا کر پھینک دیا۔ امراؤ بیگم کو اپنی باہوں میں کھینچ لینے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ پرائے معلوم ہوئے۔ اٹھنے کی کوشش تو پیر اجنبی سے لگے۔ کمر سیدھی کرنے میں وقت لگا۔ امراؤ بیگم اسے دیکھتی رہیں اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔ امراؤ بیگم نے خود لیٹ کر اس کی مشکل آسان کر دی۔ اتنے آنسو بہائے کہ وہ زہر دھل گیا جو جگر کو چاٹنے لگا تھا۔ آنسو ختم ہو گئے کہ آنسو بھی ختم ہو جاتے ہیں اور غم ایک پہاڑ کی طرح اٹل تھا کہ بڑے بڑے دریاؤں کی طغیانی ایک پہاڑ کو ہلا دینے سے عاجز رہتی ہے۔

امراؤ بیگم نے بڑی منتوں سے کھانا کھلایا، حقہ لگایا، پانوں کا چنگیر پیش کیا۔ جب وہ لیٹ گیا تو امراؤ بیگم رخصت ہوئیں۔ زینے سے لوٹ آئیں۔

"کوئی سادھو دروازے پر کھڑا آپ کو پوچھ رہا ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زینے کے دروازے پر نگاہیں گاڑے کھڑا رہا۔ زعفرانی کفنی سی پہنے، بڑی سی بلوری داڑھی اور بڑی بڑی جٹاؤں والا ایک شخص سیاہ لکڑی کا پیالہ لئے کچھ جھجکا سا کھڑا تھا۔

"آجائیے.... بابا.... آجائیے۔"

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پاس آیا۔ آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں بڑی ہونے لگیں۔ چمکیلی ہونے لگیں، گیلی ہونے لگیں۔

"میرزا صاحب!"

"ٹھاکر!"

اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"کسی کو بھنک بھی مل گئی تو میرے ساتھ تم بھی:"
"چل اندر چل ... میرے سینے سے لگ:"
وہ پا انداز پر پیر رگڑ رہا تھا اور وہ اس کی جھکی ہوئی کمر دیکھ رہا تھا۔ جس پر اس رات کا بوجھ تھا جو اتنی بھاری ہوتی ہے کہ کبھی کبھی اور کسی کسی ملک پر اترتی ہے۔ اس کی کوکھ سے وہ سورج جنم لیتا ہے جس کی روشنی میں سونا پیتل اور پیتل سونا ہو جاتا ہے۔ ابھی لال قلعہ دہلی کے سر پر جھوٹے تاج کی طرح رکھا تھا۔ لاہوری دروازے کی توپیں اتر چکی تھیں۔ پہرہ اٹھ چکا تھا۔ مغل پرچم ادبار کی آدھی رات کی سیاہی میں ڈوب چکا تھا۔ دہلی دروازہ کھلا پڑا تھا۔ دونوں طرف بندھے ہوئے ہاتھی حیرت سے پتھر ہو چکے تھے۔ شہزادے اور شہزادیاں، سلاطین اور ان کی بیگمات اور سرکاریں اور ان کے درباری اور ان کے دسترخوان پر پلنے والے پشتینی خوشامدی ایک عظیم الشان میت کے جلوس کی طرح گذر چکے تھے۔ میرزا مغل افواج شاہی کے کمانڈر ان چیف دوسرے شہزادوں کے ساتھ اپنی ٹوٹی پھوٹی پلٹنوں کے بے آبرو ہتھیاروں کی چھاؤں میں شہر پناہ کے دہلی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ دہلی دروازے سے نو محلے تک اور نو محلے سے نوبت خانے تک تمام راستہ بھاگنے والوں اور ان کے سامان سے پٹا پڑا تھا۔ اس کی پشت اور سامنا ان گنت مشعلوں کی دھوپ سے روشن تھا۔ برقندازوں، گرزبرداروں اور چیلوں کے ڈرے ہوئے چہروں سے جھلک رہا تھا۔ نوبت خانے سے

دیوان عام تک تمام عمارتیں خالی پڑی تھیں۔ تمام راستے بدنصیب بندوقوں اور بداقبال تلواروں سے پٹے پڑے تھے۔ روائتی لال پردہ ابھی تک کھنچا ہوا تھا۔ لال پردے کے پیچھے دیوان خاص کی پہلی سیڑھی پر بادشاہ سر پر تاج سینے پر قرآن پاک رکھے کمر میں تلوار ڈالے کھڑا تھا۔ دبلا پتلا بیمار بدن کانپ رہا تھا۔ داڑھی پر آنسو جڑے تھے۔ کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کے کسی ستارے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے جواں بخت اس کی اوٹ میں زینت محل۔ سامنے آخری سیڑھی پر انگریزوں کا جاسوس الٰہی بخش ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے برابر جنرل بخت خاں گھٹنوں پر جھکا کورنش کر رہا تھا۔

"ظلِ سبحانی! چالیس ہزار سوار غلام کی رکاب میں حاضر ہیں۔ جنت آشیانی شہنشاہ بابر بارہ ہزار سوار لے کر ہندوستان آئے تھے۔ عالم پناہ غلام پر بھروسہ کریں۔ محلات عالیہ مقبرے میں چھوڑ دیں اور خود بدولت دریا اتر لیں۔ خدا نے چاہا تو عرش مکانی شہنشاہ ہمایوں کی طرح دہلی دوبارہ فتح ہو گی اور

تجربے کار بڈھے جاسوس نے پینترہ بدلا۔

"اور مغلوں کا چراغ پٹھانوں کے دامن میں بجھا دیا جائے گا۔"

جنرل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ تلوار کے قبضے پر چلا گیا۔

"ربِّ ذوالجلال کی قسم اگر تم ظلِ سبحانی کے حضور میں نہ ہوتے تو اس تلوار سے جواب پاتے۔

شہنشاہ نے بیماری اور بڑھاپے کے باوجود سیڑھیاں تیزی سے طے کیں۔

"بہادر.... زبان کا جواب تلوار سے نہیں دیا جاتا.... تلوار کی جگہ میدان ہے جو تیرے ہاتھ سے نکل گیا۔"

شہنشاہ آگے بڑھ گیا۔ جنرل سینے پر دونوں ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

جب یہ جلوس دیوان عام کے سامنے آیا تو بادشاہ کھڑا ہوگیا۔

"روشنی تیز کرو... باپ دادا کے اس سجادے کو آخری بار دیکھ لوں کہ شاید..."

سیکڑوں مشعلوں اور پنشاخوں کی روشنی میں دیکھا کہ نقلی تخت طاؤس پر غلاف پڑا ہے اور شاہجہانی قانون کے مطابق دو تلوریے راجپوت کیسری بانے پہنے کانوں تک مونچھیں چڑھائے شیروں کی طرح کھڑے ہیں۔ بادشاہ نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ انھوں نے بندوقیں سیدھی کر کے سلامی دی اور تن کر کھڑے ہوگئے۔ بادشاہ ان کے قریب گیا۔ چہرے دیکھے، تیور دیکھے۔

"تمھارا کیا نام ہے؟"

"درشن سنگھ مہابلی۔"

"تم کو کمر کھولنے کا حکم نہیں ملا۔"

"ملا تھا جہاں پناہ۔"

بادشاہ کھڑا کانپتا رہا، گردن ہلاتا رہا۔

"ہم نے تمھاری خدمت معاف کی۔ جاؤ اپنے ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا کرو۔"

ٹھاکر نے سلام کے لئے گردن جھکا دی۔ گردن اٹھائی تو جلوس کے آخری آدمی کی پیٹھ پر ڈھال چمک رہی تھی۔ پھر اچانک نوبت بجنے لگی۔ آدھی رات کی نوبت بجنے لگی۔ آخری نوبت بجنے لگی۔ آخری نوبت بجنے لگی۔

"بند کرو... کانوں میں زخم ہوئے جاتے ہیں۔"

بیماری کے باوجود حکم تھا کہ ظل الٰہی دیوان خاص سے دہلی دروازے تک سارے قلعے کی زمین کو پائے مبارک سے چومتے ہوئے چلیں گے۔ نوبت خانے سے نکلتے ہی تقدیر کی طرح پیر بھی جواب دینے لگے اور جنرل کی گذارش اور جاسوس کے اشارے پر ہوادار طلب کر لیا گیا۔ شہنشاہ تکیے سے پیٹھ لگا کر نیم دراز ہو گیا اور ہوادار جامع مسجد کے راستے پر چل پڑا۔

اس بھاری رات کی کوکھ سے سورج نکلا تو سونا پیتل ہو چکا تھا۔ جامع مسجد اپنے ہزاروں ہزار نمازیوں کے خون سے وضو کر چکی تھی۔ قلعے کے نہتے دہلی دروازے پر کرنل ہملٹن کی پلٹنوں نے دھاوا کیا۔ ہاتھیوں پر چڑھی ہوئی توپوں نے گھونگھٹ کے دمدمے اور برج مٹی میں ملا دیئے۔ دروازے بارود سے اڑا دیئے۔ کرنل اور اس کے فاتح سپاہیوں کے گھوڑے نو محلے اور چر بیں مسجد کے سامنے سے گذرتے ہوئے نوبت خانے تک آگئے۔ انگریزی فوج کی مشہور عالم تنظیم کشمیری دروازے پر کام آچکی تھی۔ شہر میں لگی آگ کی لپٹیں لال قلعے کے محلوں تک آگئی تھیں۔ کرنل اپنے رسالوں کے ساتھ دیوانِ عام

کے رمنوں میں داخل ہو چکا تھا۔ جو بیں مسجد سے اٹھتا ہوا دھوئیں کا مینار دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک آواز تڑپ گئی۔

" خبردار .... تخت شاہی ... ادب لازم "

کرنل نے جھک کر گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ فیلڈ گلاس کو آنکھوں سے لگایا۔ اردگرد کے سوار پیچھے سمٹ آئے تھے۔ کرنل نے دیکھا دیوان عام کے آدھے آدھے بند مثے لال بانات کے پردوں کے پیچھے سرخ مخمل کے غلاف پہنے ستون کھڑے ہیں۔ اس نے فیلڈ گلاس ہٹا لیا۔ گھوڑے پر ترچھا ہو کر بگل بردار کو کرچ سے اشارہ کیا۔ بگل بجا۔ آناً فاناً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں سے سارا رمنہ چھلکنے لگا۔ میجر ڈگلس رکابوں پر کھڑا ہو گیا۔

" دہلی فتح ہو چکا .... ہتھیار رکھ دے .... مارا جائے گا "

الفاظ کی گونج باقی تھی کہ دیوان عام سے پہلی گولی چلی۔ ڈگلس کے برابر گھوڑے پر کھڑا انگریز بگل بردار الٹ گیا۔ ڈگلس نے گھوڑے پر قائم رہنے میں دقت محسوس کی کہ گھوڑا الف ہو چکا تھا۔

" چارج "

اس نے تلوار علم کی ... درجن بھر بندوقیں دیوان پر چلیں۔ سواروں نے دیوان عام کے دونوں بازوؤں پر ہجوم کیا۔ دیوان عام سے دوسرا فائر ہوا اور ہملٹن کے سامنے دوسرا سوار گھوڑے پر جھول رہا تھا۔ باڈی گارڈ نے اس کے چاروں طرف دیوار کھڑی کر لی۔ بائیں بازو کا رسالہ لال پردے کو پھاڑ کر دیوان کی پشت پر نکل رہا تھا اور دیوانِ عام سے تیزی کے ساتھ

سیجے فائر ہو رہے تھے ۔ وہ حیرت زدہ تھا۔ شاید بخت خاں کے کریک ڈویژن کے "مارک من" آخری مورچہ لئے ہوئے تھے ۔ اس نے حکم دیا کہ لاہوری دروازے کے سوار دریا کی ریتی پر پھیل کر راستے بند کردیں ۔ جب باڈی گارڈ گرنے لگے تو وہ خود گھوڑا ریلنے لگا ۔

"فتح کئے ہوئے قلعے کے چند پتھروں کے لئے ہم آپ کو قربان نہیں کر سکتے ۔"

ڈگلس لگام سے لپٹ گیا ۔

اب دیوان عام سے آتی ہوئی گولیوں کے درمیان وقفہ بڑھنے لگا تھا۔ ڈوبتا سورج بہت دیر نہیں لگاتا۔ اب سب کچھ خاموش ہو چکا تھا۔ اس کے اشارے پر ہر طرف کے سوار دیوان میں گھس گئے ۔ تخت طاؤس کے سامنے بہت سی دغی ہوئی بندوقوں کے درمیان دو لاشیں پڑی تھیں ۔ ہیملٹن نے تخت طاؤس پر بوٹ رکھ دیا۔ ڈگلس کو دیکھا جو مردہ سپاہیوں کے کیسری بانے اور ہتھیار دیکھ رہا تھا ۔

"اگر دہلی کے بادشاہ کو ان جیسے دو ہزار بھی مل گئے ہوتے تو ..."

اس نے اپنے آپ سے کہا ۔

"دہلی کی تاریخ بدل گئی ہوتی ۔"

ڈگلس نے جملہ پورا کر دیا ۔

وہ دیوار سے لگا بیٹھا تھا ۔ خالی آنکھیں سامنے پڑی تھیں ۔ مونچھوں اور داڑھی کے الجھے بالوں میں لفظ لرز رہے تھے ۔

"درشن سنگھ کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے"
"تم فکر نہ کرو.... تھوڑا سا کھالو کچھ.... سو رہو۔ صبح ہوتے ہی حکیم محمود خاں صاحب کے پاس چلیں گے۔ قلعے کے اندر اور باہر کی ساری فہرست ان کے پاس ہے۔ تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ خدا چاہے گا"
"اتنا معلوم ہے کہ ۱۹ ستمبر کی رات وہ تخت طاؤس کے پہرے پر تھا"
"تب تو کوئی خطرے کی بات ہی نہیں ہے"

لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ تسلیوں سے بے نیاز، امیدوں سے بے گانہ سامنے رکھے ہوئے کھانے کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس کے دیکھنے کے انداز کو دیکھ رہا تھا۔

زندگی زندہ رہنے کے ہنر سے واقف ہونے لگی۔ موت سے بچے رہنے کے جتن کرنے لگی۔ جیسے ڈوبتے ہوئے آدمی کو موجوں نے کنارے پھینک دیا ہو اور وہ منڈلاتے ہوئے گدھوں کے ناخنوں سے بچنے کے لئے اپنے ہاتھوں کی ساری قوت جمع کر رہا ہو۔ فاقوں کے سیاہ گدھ موت کے انڈوں سے نکلتے ہوئے تازہ پر نچے پورے شہر پر جھپٹ رہے تھے۔ جامع مسجد کے سامنے آیا تو انگریزوں کا دستہ ننگی کرچ کی طرح چمک رہا تھا۔ بھری ہوئی بندوقوں کی طرح مستعد تھا۔ سیڑھیوں پر ایک پھٹا ہوا برقعہ اپنے بوڑھے ہاتھوں سے دوسرے برقعے کی نقاب الٹ رہا تھا اور ایک گورا اس چہرے کو دیکھ رہا تھا جس سے تھوڑی دور تک سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔ پھٹے ہوئے برقعے نے سکے مٹھی میں دبائے، نقاب ڈالی سیڑھیاں

اترنے لگی۔ گورے کے پہلو میں کھڑے ہوئے برقعے نے نقاب اٹھائی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی ۔ اس کا جی چاہا کہ پہرے پر کھڑے ہوئے گوروں کی دیوار توڑ دے ۔ آنسوؤں سے وضو کرلے ، مینار پر چڑھ کر وہ اذان دے جسے پوری دتی صدیوں سے بھول چکی ہے اور اس نماز کی نیت کرے جس کا ایک سلام دنیا میں ہوتا ہے ، دوسرا قبر میں ۔ وہ چند قدم چل بھی پڑا کہ بدنصیب بھائی کے بلبلاتے ہوئے بچوں نے ہاتھ پکڑ لیے ، بیزوں سے لپٹ گئے ۔ وہ دنیا کی بہت سی نعمتوں کی طرح اس نماز کی نعمت سے بھی محروم رہا۔

تو یہ ہے وہ نظام حکومت جس کے تم آرزو مند تھے ۔ تمھاری تہذیب کے سینے سے جو خوں بہ رہی ہے اور اس کا ایک ایک قطرہ تم سے تمھاری دعاؤں کا حساب مانگتا ہے ۔ ہر آہ جو کسی دل سے نکلی ، ہر فریاد جو کسی جگر سے پھوٹی اس کا کون سا حصہ تمھارے نام لکھا جائے ۔ یہ پھانسیوں کے چمن یہ سولیوں کے باغ تمھاری چہل قدمی کا انتظار کر رہے ہیں ۔ قبرستان جن کے گڑھوں میں زندہ آدمی توپ دیئے گئے ۔ میدان جو ان گنت قبروں سے قبرستان ہوگئے طالب ہیں کہ ایک فاتحہ پڑھ کر ان کو نجات بخش دو کہ موجودہ نظام حکومت کے وسیلے سے تم ان کی نجات کے طالب تھے۔ محلوں کو مکانوں سے ، مکانوں کو مکینوں سے ، بازاروں کو دوکانوں سے ، دوکانوں کو خریداروں سے نجات مل گئی کہ تم نجات کے طالب تھے اسداللہ خاں غالب ۔"

"تم کون ہو ؟"

"میں ... میں تمھارا ہمزاد ہوں ، تمھارا ضمیر ہوں۔ خمار کے طنطنے میں جسے تم ضمیرِ وجود کہتے تھے ، ضمیرِ کائنات کے لقب سے مخاطب کرتے تھے ۔ میں وہ ہوں ۔ آؤ اس مغربی دروازے کی آخری سیڑھی دیکھو۔ اس پر بیٹھے ہوئے نمازی کے قدم قلعۂ معلّٰی کے دیوانِ خاص میں تختِ طاؤس پر بیٹھے ہوئے ظلِ الٰہی کے تاج کی کلغی سے بلند ہوتے تھے ... اسی سیڑھی کو بسترِ بنا کر سور چرانے والوں نے تمھاری تہذیبِ کبیر کے بے نظیر نگار خانوں کی عصمت دری کی ہے ۔ یہ تمھاری دعائے نیم شب کے دفتر میں لکھوں یا دعائے صبح گاہی کے حساب میں (درج کروں) ۔

آنسو آگئے تمھاری آنکھوں میں ... آنسو .... سات سو سال کی تہذیبِ جلیل ذبح ہو گئی ۔ منبر کے سامنے بندھے ہوئے گھوڑوں کے سموں کے نیچے کچل دی گئی اور تم صرف دو آنسو عطا کر سکے ۔ بہت قیمتی ہیں تمھارے آنسو ... خدا کے لئے ان قیمتی آنسوؤں کو چھپا کر رکھ لو کہ اگر اس بدنصیب شاہجہانی مسجد کی نظر پڑ گئی تو اپنے دونوں میناروں کے ہاتھ بڑھا کر تمھاری آنکھوں کے ان دونوں موتیوں کو توڑ لے گی ۔

اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا کسی نے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس نے بھیگی ہوئی ہتھیلیاں ہٹا لیں ۔ سامنے حکیم محمود خاں کھڑے تھے ۔ دو جوڑ آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں ۔ آنسوؤں کی زبان سے گفتگو کرتی رہیں۔

"ہم اپنے اجداد کی بدمستیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں ۔ خرمستیوں کا

کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ لوح محفوظ میں ہمارے نام یہی مرقوم تھا۔ تو پھر آئیے اپنا فرض اس طرح ادا کریں جس طرح میدان جنگ میں مجاہد ادا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم میرزا صاحب۔ موت کبھی اتنی آسان نہیں معلوم ہوئی لیکن کیا کریں آج ایک ایک دن کی زندگی ایک ایک دن کا جہاد ہے۔ جہاد اکبر ہے۔"

اور اسے اپنی سواری پر بٹھا لیا۔

دن گھسٹتے رہے جیسے بوجھ سے لدے ہوئے خچر سیدھی چڑھائی پر چڑھتے ہیں۔ راتیں کٹتی رہیں جیسے مریض بستر مرگ پر کاٹتے ہیں کہ ایک خبر آئی۔ کہاں سے آئی کسی کو نہیں معلوم لیکن آئی۔ کہ کل نماز فجر کے بعد ظل الٰہی رنگون جاتے ہوئے چاندنی چوک سے گذریں گے۔ ابھی آدھی رات باقی تھی کہ وہ اٹھ پڑا۔ ٹہلتا رہا۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو امراؤ بیگم کھڑی تھیں۔

پانی گرم ہو گیا ہے۔

"بیگم"

وہ ان سے لپٹ گیا۔ دیر تک ان کو لپٹائے کھڑا رہا۔ لرزتا رہا۔

حمام سے نکلا کمرے میں خلعت کا بقچہ کھولے بیٹھی تھیں۔ اس نے پورا لباس پہنا۔ دو شالہ کندھے پر ڈالا۔ کونے میں کھڑی ہوئی تلوار اٹھائی تو بیگم نے ہاتھ پکڑ لیے۔

"ٹھیک ہی کہتی ہو بیگم۔ تلوار تو ہماری قوم کے ہاتھ سے چھن گئی۔"

وہ باہر نکلا۔ ہر چند کہ ابھی اندھیرا تھا لیکن گلی جاگ چکی تھی۔ گلیاں بیدار ہو چکی تھیں۔ ہر گلی بیدار ہو چکی تھی۔ ہر راستہ چاندنی چوک جا رہا تھا۔ وہ

سنہری مسجد میں پہنچا تو مسجد بھر چکی تھی لیکن اسے جگہ دے دی گئی۔

بہت دیر کے بعد انگریز سواروں کا دستہ ننگی تلواریں لئے قدم قدم چلتا گذرنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک ڈولی تھی۔ عام ڈولیوں سے بلند اور کشادہ۔ ظل الٰہی ایک تکیئے سے لگے دوزانو بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے تھے۔ آنکھیں کسی طرف دیکھتی بھی تھیں تو نہیں دیکھتی تھیں۔ سواری مسجد کے قریب آئی تو سب جھک گئے۔ خدا کے گھر میں بھی کھڑے ہوئے سر جھک گئے۔ آنکھوں نے نذر نثار کی۔ ہونٹوں نے کورنش کا حق ادا کیا۔ اور وہ چلے گئے، سب چلے گئے۔ وہ بیٹھا رہا۔ گذرتے ہوئے آدمیوں کو دیکھتا رہا۔ تو دلی آباد ہونے لگی ہے۔ اس نے سوچا اور کھڑا ہو گیا۔

خفتان آثار رہا تھا کہ امراؤ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیا بات ہے بیگم؟" بیگم پاس ہی بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر چپ رہیں۔

"اتنی باتیں ہیں کہ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ نہ کہوں تو کہاں تک نہ کہوں۔"

"پھر بھی؟"

"عارف کے بچوں کے مولوی صاحب کی تنخواہ چڑھ چکی ہے۔ بچوں کے کپڑے بھی کم ہو گئے ہیں۔ گھر کے آدمی بھی بلبلانے لگے ہیں۔ پنشن کا ٹھیکرہ اور اتنے منہ اتنے پیٹ ..... لوہارو میں سب کا کہنا ہے کہ آپ کو ملکۂ انگلستان کا قصیدہ لکھنا چاہئے۔ کم سے کم جتنا قلعۂ مبارک سے ملتا

تھا اتنا تو مل ہی جائے گا۔

"ہاں ... قصیدے کی تشبیب میں ہندوستان کی تباہی کے کارناموں کا ذکر بہت مناسب رہے گا۔" بیگم نے گردن جھکالی۔

"ازل سے ہوتا آیا ہے کہ جب حاکم حکومت کے قابل نہیں رہتے تو خدا ان سے حکومت چھین لیتا ہے اور جو اس قابل ہوتے ہیں ان کو سونپ دیتا ہے۔"

"میرا کھانا باہر بھیج دینا۔" وہ اٹھ پڑا۔ بیگم صحن تک آئیں۔ پھر کھڑی ہو گئیں۔

شام ہونے لگی تھی۔ وہ سو کر اٹھا۔ غسل کیا۔ کپڑے پہنے۔ دیوان خانے میں بیٹھا ہی تھا کہ الطاف حسین حالی آگئے۔ گول ٹوپی، داڑھی، چپکن اور نوجوانی میں بڑھاپے کی سنجیدگی پہنے آئے۔ انتہائی ادب سے سلام کیا۔ دست بوسی کے بعد دوزانو بیٹھ گئے۔ تکیے کے پاس ڈاک اسی طرح رکھی تھی جس طرح آئی تھی۔ اس نے پوری ڈاک اٹھا کر الطاف حسین کو دے دی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں پر رکھ لی۔ سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں الطاف سنتا ہوں پر جب خط اجنبی معلوم ہوتا ہے تو گمان ہوتا ہے کہ یہ خط میرے دشمنوں نے لکھے ہوں گے اور مجھ بدنصیب کو ان خطابات سے یاد کیا گیا ہوگا جن کے ذکر سے شریفوں کی زبانیں جلتی ہیں۔ تم پڑھو۔ اگر کوئی کام کی بات ہو تو مجھے سنا دو۔"

میاں الطاف نے سب خط پڑھ لئے اور چاک کر دیئے اور نظریں

جھکالیں۔

"تو تمام خط گالیوں کے خط تھے" میاں الطاف نے سر کو اور جھکا لیا۔ اس نے الماری سے شراب اور گلاب کے شیشے نکالے۔ بلور کا پیالہ بھرا تھا کہ کلو آگیا۔

"ماسٹر رام چندر اور ماسٹر پیارے لال آداب پیش کر رہے ہیں"۔

"بلالو۔"

وہ دونوں کوٹ اور پتلون اور پیتابے پہنے گلے میں نکٹائیاں لگائے پا انداز پہ کھڑے تسلیمات کر رہے تھے۔ اس نے ذرا سا ابھر کر ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔ دست بوسی کی اور میاں الطاف کے پاس دو زانو بیٹھ گئے۔ اس نے پیالہ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

"حضور کا مزاج اقدس" اس نے پیالہ رکھ دیا۔

"زندہ ہوں کہ موت نہیں آتی ... مردہ ہوں کہ زندگی کے جو آثار ہوتے ہیں وہ نہیں رہے۔

"خدا ناکردہ" دونوں نے تشویش سے دیکھا۔

"دوست مر گئے یا محتاج ہو گئے۔ دشمن زندہ ہیں اور قوی ہیں اور ہماری مجبوری پہ ہنستے ہیں۔ ہم باہر نکلنے سے ایک حد تک معذور ہو گئے تو وہ جو دوسروں کے پردے میں ہم کو گالیاں سناتے تھے مجبور ہو گئے کہ ہم کو ہمارے خطوط میں گالیاں لکھیں" اس نے ایک گھونٹ لیا۔ عزیزو! کچھ حرف نویس، مصرعے گانٹھنے والے جن کا پیشہ کرم خوردہ کتابوں کا کفن

کھسوٹنا ہے، اساتذہ کے غیر معروف کلام کی جیب کاٹتا ہے۔ وہ ہمارے منھ آتے ہیں اور اس طرح آتے ہیں جس طرح بانجھ عورتیں کسی شریف اور معزز خاتون کی ساتویں اولاد کی تقریبات میں آتی ہیں۔ ان کے مخرج آواز سے لفظوں کے غلیظ تھکّے اس طرح برآمد ہوتے ہیں جیسے حیض میں لپٹی ہوئی خاموشیاں، جن کے رنگ سے کراہت کو ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ بو سے تعفّن کوتے ہونے لگتی ہے اور ہرزہ سرائی کا سنڈا سِ تخیل اپنے دامن آلائش کی تنگی پر چیخ اٹھتا ہے۔"

"عزیزو! جانتے ہو کہ ہمارے نام لکھی جانے والی گالیاں کیا ہوتی ہیں؟" تینوں نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ ذرا کی ذرا نیم نگاہ کو رخصت عطا کی۔ پھر مؤدب ہو گئے۔

"گالی .... ہم شاہانِ قلم کا وہ خراج ہے جو کم نام اور گمنام پیشہ ور حرف نویس ہمارے حضور میں گذارتے ہیں۔ خدا کی قسم گالیاں ہمارے حاسدوں کی بیٹیاں ہیں جو ہمارے تصرف میں رہتی ہیں۔ پیالہ منھ سے لگایا اور رکھ دیا۔ وہ کم سواد جن کے سیاہ لفظ خلعتِ روشنائی سے محروم رہے ہم پر تنقید لکھتے ہیں۔ ہم کو فن شعر سکھاتے ہیں۔ علی سے ذوالفقار کا تعارف کراتے ہیں۔ شاہجہاں کی انگلی پکڑ کر تاج محل کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ عزیزو گلاب کی خوشبو پر کوّے تقریریں کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں چمگادڑوں نے جگنوؤں پر تنقید کی ہے۔ جگنوؤں نے آفتابوں کی روشنی پر تنقیص لکھی ہے۔ بوڑھی عورتوں نے سوت کی انٹی پر یوسفوں کا سودا کیا

ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے یہ ہمیشہ ہوتا رہے گا۔" پیالہ ختم کر کے ڈال دیا۔

" ہم کو گرج میدار فیاض سے عطا ہوئی ہے اور ہم اس عطائے خاص پر سر سے پانوں تک زبانِ شکر ہیں۔ یہ گرج اس ہر سنری کو جو اجرت پر لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ ان کے دانتوں پر چڑھی ہوئی سونے کی کترنیں اتارتا ہے۔ اس کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہماری گرج پر حکیم آغا جان عیش، منشی مہرالاسلام اور چودھری چمن بھونکنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔" زمین سے آسمان تک سناٹا تھا۔ دیر کے بعد اولڈ ٹام کی بوتل نے مرحبا کہا۔

" حضور والا! ہم غلاموں نے سنا ہے کہ حضور والا نے توہین ذات کا جو مقدمہ عدالت میں قائم فرمایا ہے اس کی پیشی ہونے والی ہے اور حضور اپنی شہادت میں جن نامی آدمیوں کو پیش کرنے والے تھے وہ منکر ہو گئے ہیں۔"

" کافر ہو گئے۔" ماسٹر رام چندر نے اصلاح کی۔

" جی ... کافر ہو گئے تو ہم آپ کے حلقہ بگوش ہر چند کہ آپ کی خاک پا ہیں ... خدمت کے لئے حاضر ہیں۔" دونوں نے پھر گردن جھکا لی غالب نے پیالہ اٹھایا۔ ایک سانس میں خالی کر کے ڈال دیا۔ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر آنکھیں اٹھائیں۔

" تم ہمارے خُرد ہو۔"

"نہیں حضور والا نہیں ... ہم نے آپ کی جوتیوں کے صدقے میں کچھ سیکھا ہے۔"

"چلو یوں ہی سہی ... ہم دنیا کے کتنے ضرور ہیں ... کمزور اور بوڑھے بھی ہیں ... لیکن ہم درونا آچاریہ نہیں ہو سکتے جنھوں نے گرد دکھشنا میں انگوٹھا مانگ لیا۔ مستقبل مانگ لیا ... ہم تم سے تمھارا مستقبل مانگ لیں ... اپنے ارجن، اپنے تخیل کی فتح کے لئے۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے دشمن کتنے قوی ہیں ... وہ تمھارا روشن مستقبل سیاہ کر دیں گے۔"

"حضور والا۔"

"خدا کی قسم۔ ہم تمھارے مستقبل کا قتل منظور نہیں کر سکتے۔ رہا مقدمہ تو ہمارے دشمنوں نے ہماری دوستی کے پردے میں ہم کو ذلیل کرنے کے لئے ہم سے دائر کرا دیا۔ اور جب ہم ان کے جال میں پھنس گئے تو وہ بھی ہم کو ذبح کرنے کے لئے چھری تیز کر رہے ہیں۔ عزیزو! ہم اس قابل ہیں کہ ہم کو شاہراہ عام پر پھانسی دی جائے۔ جب مر جائیں تو ہماری لاش پر گھوڑے دوڑائے جائیں۔ ضیافت کے لئے چیل اور کوے بلائے جائیں کہ ہمارا کمال ہی ہمارا جرم ہے اور اتنا بڑا جرم ہے کہ الاماں الحفیظ۔

وہ کسی ضرورت سے اٹھ رہے تھے کہ کلفت لگے بڑے سے باپنچے کی لپیٹ میں بوتل آگئی اور سارے فرش کو رنگین کر گئی۔ میاں الطاف پیچھے کھسک لئے اور کھسک گئے۔ ماسٹر پیارے لال اور ماسٹر رام چندر جہاں

بیٹھے تھے اور جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے ۔ وہ جہاں کھڑے تھے بیٹھ گئے ۔ دیر تک چپ بیٹھے رہے ۔ دلگیر آواز میں خود کلام ہوئے ۔

" شاید شراب چھوڑنے کا وقت آگیا کہ اب بے حرمت کرنے لگی ہے ۔ میرے چھوٹوں کے سامنے خفیف کرنے لگی ہے .... عزیزو! میں شرمندہ ہوں ۔"

وہ تینوں ان سے زیادہ شرمندہ ہو گئے ۔

حاجت خانے سے واپس آئے ۔ گاؤ سے لگ کر بیٹھے ۔ پیچوان کے دو کش لئے ۔ ماسٹر رام چندر نے ہاتھ جوڑے اور عرض کیا ۔

" حضور والا ! بہت دنوں سے ایک مسئلہ پریشان کئے ہوئے ہے اجازت ہو تو..."

" کہو ... ضرور کہو ۔"

" ایران و عرب میں کوئی شاعر نہیں ہے جو حضور کی صف میں کھڑا ہو سکے ۔ رہا ہندوستان تو میر سے غالب تک کون ہے جو غالب کے پہلو مار سکے ۔ عوام سے خواص تک ایک بڑا طبقہ ہے جو یہ جانتا ہے ایک حد تک مانتا بھی ہے لیکن پھر ایسا کیوں ہے کہ ایک دنیا آپ کی مخالف ہے ... کسی ایک نے آپ کے خلاف آواز اٹھائی تو چار طرف سے اس کی تائید ہونے لگی ۔ کسی کو تردید کی توفیق نہ ہوئی ۔ ایسا کیوں ہوا ... ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر فرش پر ڈال دی۔ ہندوستان کا مسلمان رجعتِ قہقری میں مبتلا ہے۔ ایک مدت سے مبتلا ہے۔ برائے نام حکومت کا پردہ پڑا تھا۔ اُٹھ گیا۔ سارے داغ دھبے دور سے نظر آنے لگے۔ زوال کی پہچان ہی یہ ہے کہ بڑے بڑے لفظوں کے معانی چھوٹے ہو جائیں اور نظام قدرت یہ ہے کہ تخت چھوٹے ہوں یا بڑے خالی نہیں رہتے۔ تو ان تختوں پر چھوٹے چھوٹے معانی رکھنے والے چھوٹے چھوٹے لفظ بیٹھ گئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ چھوٹے اور بڑے نیک اور بد خالق اور مخلوق کی تفریق ختم ہونے لگی۔ درجہ بدرجہ ختم ہونے لگی۔ اس حد تک ختم ہو گئی کہ جو حق کے معانی جانتا بھی ہے وہ اپنے چھوٹے سے ذاتی زیاں کے خوف سے خاموش رہتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ناحق کو حق مان لیتا ہے اور پھر اپنے مفاد کی حفاظت اور اپنی انا کے تحفظ کے لئے ناحق کی تبلیغ کرنے لگتا ہے۔ ایک بات اور، جرائم پیشہ لوگ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے یار ہو جاتے ہیں ایک دوسرے کا دست و بازو بن جاتے ہیں۔ دلی کے اکثر شہدے ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں جب کہ شرفا اپنی تہذیب کے رچاؤ سے مجبور ہیں کہ ملاقات میں بھی تکلف سے پیش آئیں۔ دس پانچ ملاقاتوں میں بھی تامل سے قریب آئیں اور قریب آنے پر بھی ایک فاصلہ قائم رکھیں۔ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے کوسوں دور رہیں یعنی اپنی ذلت اور نکبت کے زخموں کو چاٹتے رہیں سڑاتے رہیں۔ اور شہدے ایک آواز پر جمع ہو جاتے

ہیں اور اپنی بہو بیٹیوں کی چھاتیوں کے گھاؤ چٹکیوں میں دھو ڈالتے ہیں۔ تو عزیزو! یہ نجابت اور شرافت کی قیمت ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے قبیلے کے ہر فرد نے ادا کی ہے اور ہمارے قبیلے کے ہر فرد کو ادا کرنی پڑے گی۔"

گالیاں سنتے سنتے سماعت پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر رخصت ہونے لگی تھی۔ گالیاں پڑھتے پڑھتے بصارت بھی اٹھنے کے لئے پہلو بدلنے لگی۔ سیر و تفریح کی راحت سے مجبور، پڑھنے لکھنے کی لذت سے معذور۔ دن رات کی طرح دھندلے، رات دن کی طرح میلی... زندگی... کیڑوں بھرا کباب تھی جو چارپائی کے طباق پر رکھی رہتی۔ ضرورتوں اور اذیتوں کی مکھیاں بھنکتی رہتیں۔ جب یہ پہلو جلنے لگتا تو کوئی اٹھا کر دوسرے پہلو پر ڈال دیتا اور وہ اپنے اٹھنے کا انتظار کرتا۔ انتظار ... اس ایک لفظ کے چار نقطے دن کے چار پہروں کی طرح، رات کے چار پہروں کی طرح اس کے زخموں سے کھیلتے رہتے۔ انتظار کے چھے حرف چھے سمتوں کی طرح چھے خاردار تاروں کی طرح اس کے داغوں کو چاٹتی رہتیں، دہکاتی رہتیں اور وہ جو بچپن سے انتظار کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔ آج بھی انتظار کے پنجوں میں سسک رہا تھا۔ انتظار کی صورت بدل گئی لیکن انتظار باقی رہا... کل انتظار کا نام ایک کھلونا تھا۔ اور آج انتظار کا نام موت۔